INTERNATIONAL EDITION

TOUCH OF CLASS

اشفاق احمد

کا

زاویہ





ٹی اینڈ ٹی پبلشرز
بینک کالونی، سمن آباد، لاہور (پاکستان)
042-7576894 Mob: 0300-4191687



© Ptv اور ٹی اینڈ ٹی پبلشرز کی مشترکہ پیشکش

ASHFAQ AHMAD'S ZAVIA

ہماری کتابیں آپ کی شعوری عمر میں اضافہ کرتی ہیں

PRODUCTION: GHULAM HUSSAIN GHAZI	اہتمام اشاعت: غلام حسین غازی
COMPILERS: SHOUKAT ZAIN-UL-ABDEEN ZAFAR AHMAD KAMAL	مرتبین: شوکت زین العابدین، ظفر احمد کمال
FIRST EDITION: 7TH SEPTEMBER 2005	اشاعت اول: 7 ستمبر 2005ء
PORTRIAT: TARIQ MIRZA (SAHIWAL)	پورٹریٹ: طارق مرزا (ساہیوال)
TITLE & COMPOSING: MOHSIN GRAPHICS, LAHORE	ٹائٹل اور کمپوزنگ: محسن گرافکس، لاہور
PROOF READING/EDITING: SHAHBAZ AHMAD BHATTI	پروف ریڈنگ/ایڈیٹنگ: شہباز احمد بھٹی
LEGAL ADVISORS: KHURSHEED AHMAD SODHI (SUPREME COURT) LAILA KHATTAK (HIGH COURT)	قانونی مشیران: خورشید احمد سودھی (سپریم کورٹ) لیلیٰ خٹک (ہائی کورٹ)
CONSULTANCY: ALI ARSHAD ZULFIQAR, ANILA TIWANA, ALI IMRAN SHABNAM MIRZA, SHAHID BUKHARI, SAIMA ALMAAS	مشاورت: علی ارشد ذوالفقار، انیلہ ٹوانہ، علی عمران شبنم مرزا، شاہد بخاری، صائمہ الماس

DISTRIBUTER:
تقسیم کار: سٹی بک پوائنٹ، اُردو بازار، کراچی

CITI BOOK POINT, URDU BAZAR, KARACHI
021-32762483, 0322-2820883, 0312-2306716



سے تعلق رکھنے والے خواتین، حضرات براہِ راست ادارے سے خصوصی رعایت پر اپنے لیے اور اپنے احباب کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔

ISBN NO: 969-8305-80-7

انتساب

Ptv لاہور سنٹر کے قابل فخر پروڈیوسر

اور بابا جی (اشفاق احمد) کے مریدِ خاص

شوکت زین العابدین کے نام

عکس تحریر

بڑے درخت پھل زیادہ نہیں دیتے سایہ
زیادہ دیتے ہیں!

اشفاق



اشفاق احمد ——— پورٹریٹ: طارق مرزا

مختصر سوانحی خاکہ

نام	:	اشفاق احمد خان
قلمی نام	:	اشفاق احمد
پیدائش	:	22 اگست 1925ء (مکیسر، فیروز پور، مشرقی پنجاب، بھارت)
تعلیم	:	ایم۔اے (اردو) گورنمنٹ کالج لاہور، اٹالین زبان میں ڈپلوما، روم یونیورسٹی (اٹلی)، فرانسیسی زبان میں ڈپلوما، گرینوبل یونیورسٹی پیرس فرانس، براڈکاسٹنگ ٹریننگ نیویارک یونیورسٹی امریکا، بریڈ لاف رائٹرز ورکشاپ ورماؤنٹ امریکا۔
وفات	:	7 ستمبر 2004ء (لاہور، پاکستان)

مختصر حالاتِ زندگی:

بچپن اور لڑکپن فیروز پور، مشرقی پنجاب میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے اور ایک مزنگ روڈ، لاہور میں رہائش اختیار کی۔ گھریلو حالات اچھے نہ ہونے کے سبب اشفاق احمد دفتر روزگار پہنچے گریجویٹ ہونے سبب ملازمت نہ مل سکی تو اگلے روز میٹرک کی سند دکھا کر محکمہ ریلوے میں ملازمت اختیار کی، جہاں صرف ایک دن گزارا۔ اس کے بعد مہاجرین کے کیمپ واقع والٹن میں ملازم ہو گئے۔ ایک دن سودی خانہ میں گزارا اور اگلے روز لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ والے شعبہ میں منتقل ہو گئے۔ 1956ء میں بانو قدسیہ سے گھر والوں کی مرضی کے برخلاف شادی ہوئی۔ بانو اور اشفاق نے لاہور سے اَدبی مجلّہ "داستان گو" جاری کیا۔ ریڈیو سے تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین المعروف علی بابا نے

ڈراما نگاری کے سلسلے میں راہنمائی کی تو اشفاق احمد نے "اُچی ماڑی" جیسا مقبول ریڈیائی ڈراما قلم بند کیا۔ 1968ء میں اشفاق احمد نے لاہور ریڈیو سے "تلقین شاہ" پروگرام شروع کیا۔ بطور لیکچرر شعبہ اردو دیال سنگھ کالج لاہور سے منسلک ہوئے اور وہاں سے روم یونیورسٹی اٹلی چلے گئے۔ دو برس "لیل و نہار" لاہور مرتب کیا۔ چار برس تک ڈائریکٹر آر۔سی۔ڈی ریجنل کلچر انسٹی ٹیوٹ رہے۔ 1987ء تک ریڈیو کے مستقبل پروگرام "تلقین شاہ" کے علاوہ 48 ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے لگ بھگ ساڑھے تین سو فیچر اور ڈرامے قلم بند کیے۔

اُردو سائنس بورڈ لاہور میں 17 جون 1967ء سے یکم جولائی 1989ء (عرصہ 22 سال) تک ڈائریکٹر جنرل رہے۔ 26 مارچ 1991ء تا 19 جون 1993ء (عرصہ 2 سال) دوبارہ یہ عہدہ سنبھالا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"توبہ" مطبوعہ "ادبی دنیا": لاہور 1942ء

مطبوعہ کتب:

1- "ایک محبت سو افسانے" (13 افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور: طبع اوّل: 1951ء

1- "توبہ" ' 2- "فہیم" ' 3- "رات بیت رہی ہے" ' 4- "تلاش" '
5- "سنگ دل" ' 6- "مسکن" ' 7- "شب خون" 8- "توتا کہانی" '
9- "عجیب بادشاہ" ' 10- "بندرابن کی کنج گلی میں" ' 11- "بابا" '
12- "پناہیں" ' 13- "امی"۔

واضح رہے کہ افسانہ "توبہ" کا عنوان اشفاق احمد نے "جعفری" رکھا تھا' جسے شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" میں شائع نہ کیا اور مولانا صلاح الدین احمد نے "ادبی دنیا" کے لیے اس کا عنوان "توبہ" تجویز کیا۔

-2 ''اجلے پھول'' (8 افسانے اور ایک رپورتاژ) بک لینڈ' لاہور:
طبع اوّل: فروری 1957ء
1- ''اجلے پھول'' 2- ''گل ثریا'' 3- ''سنکہ'' 4- ''حقیقت نیوش'' 5- ''توشے بلے'' 6- ''صفدر ٹھیلا'' 7- ''گڈریا'' 8- ''برکھا'' 9- ''ایل ویرا''۔ (روم سے متعلق رپورتاژ)

-3 ''سفرمینا'' (گیارہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور:
طبع اوّل: اپریل 1983ء
1- ''اٹوٹ مان'' 2- ''قاتل'' 3- ''قصہ تل وفتی'' 4- ''چور'' 5- ''مانوس اجنبی'' 6- ''بیا جاناں'' 7- ''محسن محلّہ'' 8- ''پانچ میل دور'' 9- ''کالج سے گھر تک'' 10- ''گاتو'' 11- ''فل برائٹ''

نوٹ: اشفاق احمد نے (1988ء) تک کل 35 افسانے قلم بند کیے ہیں۔ 32 افسانے ان تین مجموعوں میں یکجا کر دیئے گئے ہیں جبکہ تین افسانے ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے' جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) ''ماسٹر روشی'' مشمولہ: ''1971ء کے منتخب افسانے'' مرتبہ: ناصر زید صفحہ 25 تا 46۔

(2) ''سونی'' مطبوعہ: ''ادب لطیف'' لاہور شمارہ 3-4 بابت سال 1983ء صفحہ 56 تا 24۔

(3) ''بندر لوگ'' مطبوعہ: ''نیا دور'' کراچی افسانہ نمبر۔

-4 ''تاہلی تھلے'' (پنجابی ڈرامے)

-5 ''مہمان بہار'' (ناولٹ) مکتبہ میری لائبریری' لاہور: طبع اوّل: 1955

-6 ''وداع جنگ'' از ارنسٹ ہیمنگوے کا انگریزی سے ترجمہ (دو جلدیں) ملک دین محمد: یونائیٹڈ بک ڈپو' لاہور: طبع اول: جنوری 1960ء۔
یہ ''A Farewell to Arms'' کا ترجمہ ہے۔

7- "چنگیز خاں کے سنہری شاہین" از رتاشی کا انگریزی سے ترجمہ۔ مکتبہ معین الادب لاہور بہ اشتراک موسسہ فرینکلن نیویارک طبع اول: 1960ء
یہ "The Golden Hawks of Genghis" (ناول) کا ترجمہ ہے۔

8- "کھیاویا" (پنجابی آزاد نظمیں) مطبوعہ سنگ میل' لاہور: طبع اوّل: 1988ء

9- "توتا کہانی" (ٹی۔وی ڈرامے)

10- "تماکار" (مزاحیہ)

11- "گرما گرم" (مزاحیہ)

12- "مفت زبانی لغات" مرکزی اُردو بورڈ' لاہور (مرتبہ)

13- "دوسروں سے نباہ" (از ہیلن جیکو کا ترجمہ) گوشہ ادب' لاہور: طبع اوّل:
یہ تراسی صفحات کی کتاب "Getting along with others" کا ترجمہ ہے۔

دیگر: ایک ہی بولی' سہانے فسانے' بندگلی' مہمان سرائے' من چلے کا سودا' بابا صاحبا' سفر در سفر' اُچے برج لاہور دے' طلسم ہوش افزا اور ڈرامے ننگے پاؤں' حسرت شہر جنگ' زاویہ' ایک محبت سو ڈرامے' حیرت کدہ' شاہلا کوٹ' کھیل تماشا' گلدان' دھینگا مشتی' شوراشوری اور ڈھنڈورا۔

زاویہ: 21 اکتوبر 1998 تا 14 فروری 2004

کل 90 پروگرام PTV' لاہور

مستقل پتا:

"داستان سرائے" C-121' ماڈل ٹاؤن لاہور' پاکستان۔

فون: 042-5880653

اعزازات:

1- ممبر انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد یونیورسٹی

2- ممبر پاکستان کورسز کمیٹی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور

3- ممبر تعلیم بالغاں سوسائٹی گوجرانوالہ

4- ممبر بورڈ آف سٹڈیز (پنجابی) پنجاب یونیورسٹی لاہور

5- ممبر اکادمی ادبیات پاکستان (مرکزی باڈی) اسلام آباد پاکستان

6- ممبر ترقی اردو بورڈ کراچی

7- ممبر ہجرہ کمیٹی اسلام آباد پاکستان

8- ممبر (مرکزی کمیٹی برائے پاکستان) برکلے اردو پروگرام برکلے یونیورسٹی امریکا

9- ممبر نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد پاکستان

10- مدیر اعلیٰ (اعزازی) ماہنامہ "سکھی گھر" لاہور

11- "پرائڈ آف پرفارمنس" حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز 1979ء

12- دوہا قطر ایوارڈ

13- ستارہ امتیاز

* *



بانو قدسیہ ———— پورٹریٹ: طارق مرزا

زاویہ کی تاریخ

پروگرام ''زاویہ'' پہلی بار 21 اکتوبر 1998 کو ٹیلی کاسٹ ہوا، اور اسکے پروڈیوسر اعظم خورشید صاحب تھے۔ انہوں نے 35 پروگرام ریکارڈ کیے اور آٹھ ماہ بعد ریٹائر ہو گئے۔ شوکت زین العابدین صاحب نے پہلا پروگرام 21 نومبر 2002 کو PTV، لاہور سے نشر کیا اور یہ سلسلہ 14 فروری 2004 تک جاری رہا۔ پھر یہ سلسلہ اشفاق احمد صاحب کی طویل علالت کے باعث منقطع ہو گیا۔ اشفاق احمد 6 ماہ تک مسلسل بیمار رہنے کے باعث آخرکار 7 ستمبر 2004 کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ اس طرح شوکت زین العابدین کے دور میں ''زاویہ'' پروگرام کی ریکارڈنگ

کا سلسلہ تقریباً ساڑھے تین برس تک جاری رہا۔ شوکت زین نے 55 پروگرام ریکارڈ کیے۔ اس طرح PTV نے ''زاویہ'' کے کل 90 پروگرام ریکارڈ کیے۔ یاد رہے کہ ''زاویہ'' کے 10 پروگرام اشفاق احمد کے بیٹے اثیر احمد خان نے اپنے گھر یعنی ''داستان سرائے'' میں بھی ریکارڈ کیے اور PTV کو براہِ راست فروخت کیے۔ ان پروگرامز کے ٹیلی کاسٹ ہونے کے بعد ہی PTV نے ''زاویہ'' اپنے اسٹوڈیو (لاہور) میں ریکارڈ کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ''زاویہ'' پروگرام میں اشفاق احمد کو بولنے پر فی پروگرام 10 ہزار روپے دیے جاتے تھے، جبکہ سننے والوں کو فی پروگرام 500 روپے دیے جاتے تھے، جنکی تعداد فی پروگرام 20 تا 25 ہوا کرتی تھی۔

حاضرین کا انتخاب زیادہ تر اشفاق احمد ہی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار پروڈیوسر بھی مہمانوں کی نامزدگی کر دیا کرتے۔ ناظرین نے اس پروگرام کو شدت سے پسند کیا اور ملک بھر سے اس پروگرام میں شرکت کرنے کیلئے درخواست کی جاتی تھی لیکن ترجیح ہمیشہ پنجاب (لاہور سے قریبی علاقوں) کو دی جاتی تھی۔

حاضرین کو پروگرام کے پہلے 20 منٹ گزرنے یعنی پروگرام کو سمجھنے کے بعد سوالات کی اجازت تھی۔ وہ اشفاق احمدؒ سے مزید توجیہات کیلئے سوال کرتے اور وہ انہیں موقع پر ہی جواب دے دیا کرتے۔ پروگرام کی ریکارڈنگ کے دوران کبھی کوئی غیر معمولی صورت حال پیش نہیں آئی۔ بیٹری لائٹ سے 10 منٹ پورے ہونے کا

اِشارہ دیا جاتا تھا۔کل ریکارڈنگ 20 تا 22 منٹ کی ہوا کرتی تھی۔

دوسرے اشارے یعنی 20 منٹ پورے ہونے پر اشفاق احمد پروگرام کو وائنڈ اَپ کرنا شروع کر دیتے تھے۔اشفاق احمد ''زاویہ'' میں کس موضوع پر بات کریں گے اس بات کا پروگرام پروڈیوسر کو بھی پتہ نہیں ہوتا تھا۔''زاویہ'' کی پندرہ روز میں دو ریکارڈنگ ہوا کرتی تھیں،وہ بھی ایک ہی روز پونے چار سے ساڑھے چار بجے تک اور پھر ساڑھے چار بجے سے سوا پانچ بجے تک۔دوسرے پروگرام کے حاظرین یعنی شرکاء بدل جایا کرتے تھے۔شوکت زین نے اپنے دور میں ''زاویہ'' پروگرام کے چھ سیٹ تبدیل کیے۔کسی میں جنگل کا منظر پیش کیا گیا اور کسی میں گاؤں کا۔ایک سیٹ واصف علی واصف کے گھر ہونے والی نشست کی طرز پر بھی لگایا گیا۔

PTV پروڈیوسر شوکت زین العابدین کے مطابق اشفاق احمد اُن کے مُرشدِ گرامی ہیں اور اُن کی وابستگی صرف ''زاویہ'' پروگرام تک ہی محدود نہیں بلکہ اُنہوں نے اشفاق احمد کے بے شمار ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے پیش کیے۔طویل دورانئے کے کئی ڈراموں کے علاوہ ''توتا کہانی'' اور خاص طور پر اشفاق احمد کی زندگی کا پہلا سیریل ''شاہلا کوٹ'' بھی شوکت زین العابدین ہی کو کرنے کا موقع ملا۔اور یہ اعزاز انہیں 2001 میں ملا۔اِس سے پہلے اُنہوں نے اشفاق احمد کے صرف ڈراما سیریز کیے تھے۔

''زاویہ'' پروگرام پر حکومت اور عوام کی طرف سے خاصی تنقید بھی ہوئی۔ اِس کے موضوعات پر اعتراض کیا گیا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ پروگرام میں کہی گئی باتیں عہد حاضر کے حوالے سے ذرا سخت ہیں اور قبل از وقت کہی گئی ہیں جب کہ اشفاق احمد صاحب کا موقف یہ تھا کہ انسان چاند کو تسخیر کر چکا اور اب آسمانوں اور کہکشاؤں میں اپنی منزلیں تلاش کر رہا ہے۔ تو اُس پر لازم ہے کہ وہ اِس خیال سے سمجھوتہ کرے اور ماضی پرستی سے گریز کرے۔ اگر انسان کو جدید انسان، ترقی پسند انسان بننا ہے تو اُسے آج کی دوڑ میں شامل ہونا پڑے گا۔ اُن کے خیال کے مطابق اسلام بہت جدید علوم کا مذہب ہے۔

''زاویہ'' پروگرام میں شرکت کرنے والے چند مشہور اور معزز مہمانوں کے نام پروڈیوسر شوکت زین العابدین کے مطابق یہ ہیں:

شہزاد احمد (شاعر)	عباس نجمی (کمپیئر)
عائشہ اسلم (افسانہ نگار)	ترنم ناز (گلوکارہ)
سیمی راحیل (اداکارہ)	ڈاکٹر عبدالحق (ڈینٹسٹ)
ظفر علی راجہ (شاعر/وکیل)	نورالحسن (کمپیئر)
خالد احمد (شاعر)	نجیب احمد (شاعر)
توقیر بن اسلم (ڈرامانگار)	غیور اختر (اداکار)

نثار قادری (اداکار)
خورشید قادری (فلم پروڈیوسر)
محسن جعفر (اخباری رپورٹر)
خالدہ ارجمند (فنکارہ)
عطاء الحق قاسمی (کالم نگار)
فدا احمد کاردار (صحافی)
اصغر ندیم سیّد (ڈراما نگار)
نذیر حسینی (اداکار)
عارف لوہار (فوک گلوکار)
فوزیہ تبسم (افسانہ نگار)
مستنصر حسین تارڑ (کمپیئر)
رُستم (اداکار)
نیر اعجاز (اداکار)
رخشندہ نوید (شاعرہ)
نیلم احمد بشیر (افسانہ نگار)
ڈاکٹر امجد پرویز (گلوکار)
ڈاکٹر سلیم اختر (نقاد)
خیام سرحدی (اداکار)
امجد اسلام امجد (شاعر)
آغا شاہد (اداکار/ہدایتکار)
اور نیلما ناہید درانی (شاعرہ)

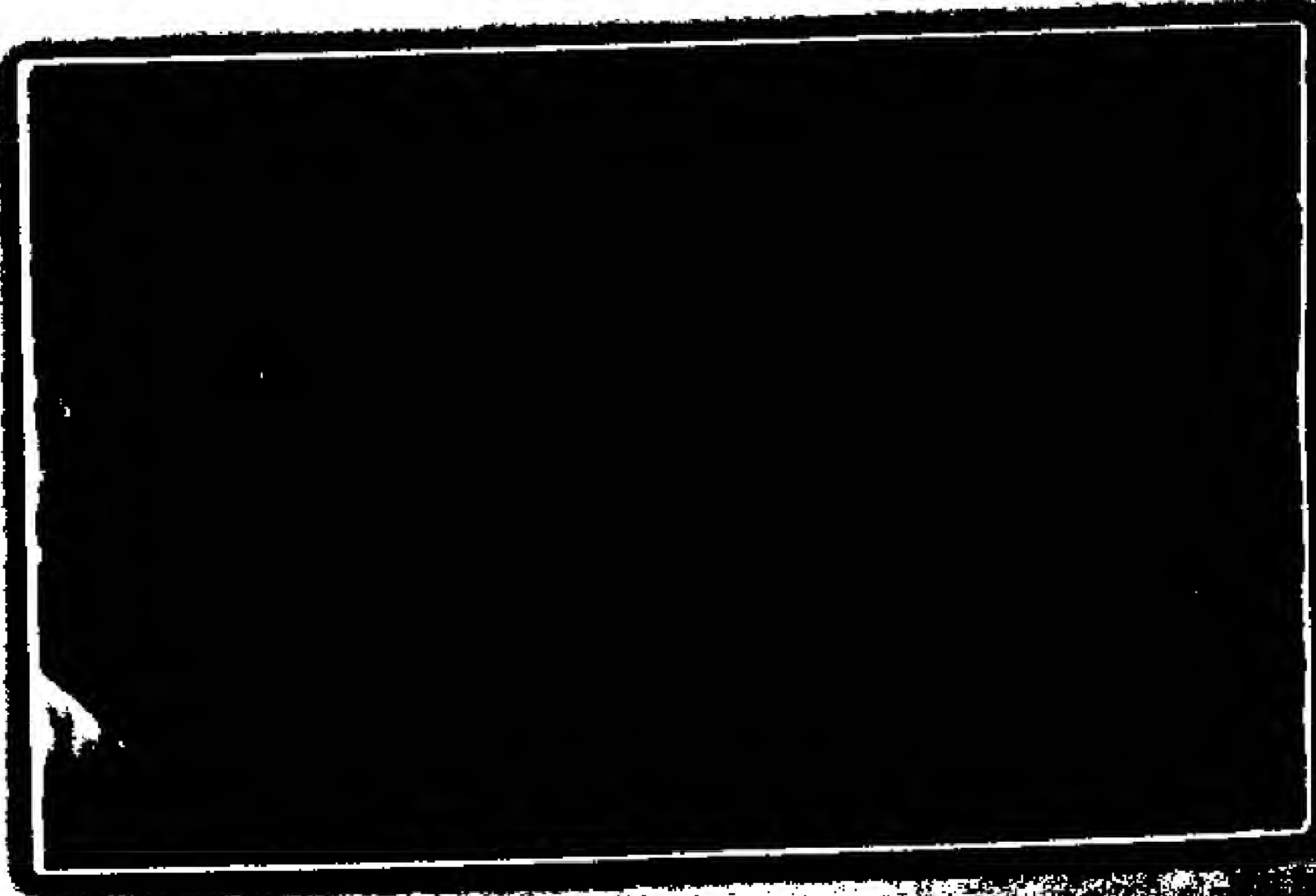
اِن سب خواتین وحضرات کو PTV کی پالیسی کے مطابق پروگرام میں شرکت کرنے پر 500 روپے بطورِ اعزازیہ بھی پیش کئے گئے۔

''زاویہ''

کی ریکارڈنگ —— چند جھلکیاں



اشفاق احمد مہمانوں کے ساتھ



 "زاویہ"

کی ریکارڈنگ ——— چند جھلکیاں



"زاویہ"

کی ریکارڈنگ ـــــ چند جھلکیاں



اشفاق احمد صاحب "زاویہ" پروگرام ریکارڈ کرواتے ہوئے



اشفاق احمد 22 اگست 2004 کو اپنی آخری سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے



بانو قدسیہ، اشفاق احمد کو بیماری میں حوصلہ دلاتے ہوئے



اشفاق احمد نے اپنی ذاتی لائبریری میں زندگی کے بیش قیمت لمحات گزارے

قطعہ تاریخ وفات

اشفاق احمد

از: شان الحق حقی (کنیڈا)

آنکہ در راویاں سر آمد بود
روزگارش ہم آہ سر آمد
سال تاریخ "باکمال اشفاق
داستاں گوے نامور" آمد

۱۴۲۵ھ
(7 ستمبر 2004)

ماڈل ٹاؤن (ڈی بلاک) لاہور میں
باباجی کی آخری آرام گاہ





زاویہ

کے حوالے سے اشفاق احمد کے نام
موصول ہونے والے چند منتخب

خطوط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

[illegible] مظفر گڑھ

(پنجاب)

[illegible] صاحب

قابل تعظیم محترم [illegible] صاحب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مظفر گڑھ

[illegible]

30/5/[illegible]

بھاگووال سیالکوٹ

ذی وقار اشفاق احمد صاحب

آداب و سلام۔

پہلے تو آپ کی خدمت میں سلام عرض کروں گا۔

جناب ذی احترام میں ایک ادنیٰ سا آپ سے پیار کرنے والا ہوں۔

جناب محترم آپ کی شگفتہ اور دلفریب باتیں سن کر اپنے بخت پہ ناز کرتا ہوں۔ میٹھی میٹھی اور پیاری باتیں دل کو تروتازگی عطا کرتی ہیں اور روحانی اسباق ملتے ہیں چونکہ ہم بابوں کے متلاشی ہیں۔ جناب میں سکول ٹیچر ہوں ویسے تو سائنس ٹیچر ہوں B.Sc. B.Ed کرنے کے بعد ادبی ذوق کے پیش نظر ایم۔ اے اردو کیا ہے کافی دیر سے دل میں تشنگی ہے کہ کیا چھپا ہو

کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر پیاری پیاری باتیں سنوں،
تاکہ میرے ادبی ذہن کو ایک فرصت اور کشادگی ملے۔
جب کوئی اجازت نامہ وغیرہ یا کوئی پروگرام ملے۔
میرا کام تو صرف عرض کرنا تھا وہ میں
کر چکا باقی محبوب کے سامنے تو عرض ہی ہوتی ہے
وہاں عقل ناکام ہے اس کو کنٹرول کرنا چاہیے۔
باقی مجھے لکھنے میں بھی خفگی ہو رہی ہے کہ کیا لکھوں
آپ کی شان کے سامنے میں کیا ہوں۔

آنکھوں میں نور دل میں محبت ہے آپ کے
میں خود تو کچھ نہیں میری قیمت ہے آپ سے

آپکا نیازمند
شمشیر احمد

Dear Sir,
I am a very keen viewer of 'zawia'. Nice effort for providing us the food for thought. Jazak'Allah. Keep it up!!
Your stories fantasize me very much. God has gifted you the art of story telling. It's only your specialty that you interlink everyday events with the spiritual ~~being~~ Phenomenon.
I wish to write an article based upon one of your stories. I'll try my luck for some e-journals as it's almost impossible for our newspapers. You know how difficult it is for the newcomers to get published. So kindly give me the permission to use your stories/events from 'zawia'. I shall be thankful.
If you will like I can e-mail the articles to you for the final approval.

Siret Fatima
cciret@hotmail.com
23/E Askari III
Chaklala Sch. III
Rawalpindi Cantt.

گکھڑ۔ ضلع گوجرانوالہ
7/8/03

قابل احترام جناب اشفاق احمد صاحب

السلام علیکم۔ 6 اگست کی صبح آپ کا پروگرام پی ٹی وی پر دیکھ رہا تھا۔ آپ نے یادداشت کی بہتری کے لیے ایک یونانی جڑی بوٹی غالباً اُسطخودوس کا نام لیا تھا۔ لیکن مکمل نسخہ سمجھ میں نہ آ سکا۔ میری یادداشت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ عمر تقریباً 72 سال ہے۔ عزیز و اقارب اور دوستوں کے نام بھول جاتا ہوں۔ جس سے بعض دفعہ کافی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔

آپ کا بے حد ممنون ہوں گا آپ مجھے مکمل نسخہ اور دوائی کی مقدار سے آگاہ فرمادیں۔

بہت بہت شکریہ

والسلام
نیازمند
ریاض احمد چیمہ
جی ٹی روڈ۔ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
پوسٹ کوڈ۔ 52200

بسمہ تعالیٰ

از کراچی
۱۰ر اگست ۲۰۰۳ء

محترم اشفاق احمد صاحب

السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔
پروگرام "زاویہ" کے حوالے سے آپ کی باتیں سن کر بہت سی
بار آنکھیں ڈبڈبا بھی جاتی ہیں۔ اور پھر وہی دعا دل سے
نکلتی ہے جو میں اپنے لئے بھی کرتا ہوں کہ ہمارا خاتمہ ایمان
پر ہو۔ کیونکہ شیطان تو آخر وقت تک ورغلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔
آپ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں سننے اور کرنے کو طبیعت
چاہتی ہے۔ انشاءاللہ ۱۹ ستمبر سے ۲۹ ستمبر تک میں لاہور
میں رہوں گا۔ کیا ملنے کی کوئی سبیل ہے؟

والسلام
فیضیاب علی
7/10-A-2- ناظم آباد کراچی 74600

محترم اشفاق احمد صاحب

اسلام وعلیکم !

امید ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ میرا نام نوید شہزاد ہے اور میں راولپنڈی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں ابھی ایم اے انگلش پارٹ ون کے پیپرز دے کر فارغ ہوا ہوں۔

اس خط میں میں جو کچھ لکھ رہا ہوں یقین کیجئے دل کی گہرائیوں سے لکھ رہا ہوں اس بات میں رائی کے دانے کے برابر بھی شک نہیں ہے کہ آپ کے پروگرام کی وجہ سے میری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی ہے کیونکہ اس نے میری سوچ کو کافی حد تک بدل کر بہتر سمت میں بڑھنے کا موقع دیا ہے۔ زندگی کے ہر موقع پر آپ کی باتیں میرے لئے بہت مددگار ثابت ہو رہی ہیں اور انشاء اللہ ہوتی رہیں گی۔ یقین کیجئے اسی وجہ سے میں نے اور بہت سے قریبی لوگوں کو "زاویہ" دیکھنے کی ترغیب دی اور ان لوگوں نے بھی آپ کی بے حد تعریف کی۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں تو آپ کا دیوانہ ہو چکا ہوں۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ آپ کو دیکھوں آپ سے ملوں اور آپ کو سامنے بیٹھ کر سنوں۔ اسی لئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں کہ میری شاید آپ سے ملاقات کی شدید خواہش کو عملی شکل دے سکوں۔ برائے مہربانی میری اس دلی سی خواہش کی تکمیل کیلئے میری مدد کیجئے اور پروگرام میں میری [illegible] شرکت کو ممکن بنانے کے لئے مجھے اس کے طریقہ کار سے جتنا جلد ہو سکے آگاہ کیجئے۔

میں اس دعا کے ساتھ خط کا اختتام کرتا ہوں کہ اللہ آپ کے علم کے ساتھ ساتھ عمل میں بے حد اضافہ فرمائے اور اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ

فقط۔ نوید شہزاد

E-mail: naveed_lamas@yahoo.com
Postal Address: House No, 18, Block No. 48,
Gracy Line Chaklala Rawalpindi.

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1-	اللہ والے لوگ	36
2-	زندگی کے اِسرار	48
3-	بابوں کی نشانیاں	60
4-	نیک خواہشات	72
5-	بات ہے سمجھ کی	84
6-	وفا کے موتی	96

-7	اے وطن! پیارے وطن	110
-8	خُدا کس کی سنتا ہے	122
-9	احساس	136
-10	مہذب زندگی	148
-11	اپنے اندر کا سفر	162
-12	بابائے قوم	174
-13	بلوچوں کا ڈیرہ	186
-14	خیال کی قوت	198
-15	معمہ زندگی	208
-16	اُوراد و وظائف	220

(جو زندگی کے آخری ایام میں باباجی کا معمول رہے)



موضوع

اللہ والے لوگ

منظر: اشفاق صاحب آسمانی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے ہیں۔ اُن کے دائیں بائیں خواتین بیٹھی ہیں۔

مہمان: فوزیہ تبسم (براڈکاسٹر، سکرپٹ رائٹر، کمپیئر، افسانہ نگار اور صوفی تبسم اکیڈمی کی چیئرپرسن)

اللہ والے لوگ

اس محفل میں یہ بات طے نہیں ہوتی یا میں سوچ کے نہیں آتا کہ آج کیا بات کریں گے بیچ میں گفتگو کے دوران ہی کچھ نہ کچھ نکل آتا ہے اور وہ آپ تک پہنچ جاتا ہے لیکن آج پہلی مرتبہ مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ آپ اپنے بابا کے بارے میں بات ضرور کریں۔ پہلے پہلے ابتدا میں تو کی، پھر اس کے بعد کچھ اور موضوعات رہے، پھر کہیں ان موضوعات سے پھسل کر آگے نکل گئے تو آج یہ فرمائش جو ہے مجھے بھی دل سے پسند آئی ہے۔

اور آپ سب نوجوان ہیں، اور یہ بات میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ بابے کون ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہماری زندگیوں میں آ گئے، اور ان کے ساتھ کیا تعلق ہوتا ہے اور ملتان میں بابے زیادہ کیوں ہوتے ہیں، اور شہروں میں کم کیوں ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو چونکہ

یہ فرمائش کی گئی ہے۔تو میں یہ عرض کروں کہ ہمارا ایک ڈیرہ تھا، جہاں میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد ولایت میں رہنے کے بعد ولایت کی یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد جب لوٹ کے یہاں آیا تو 1954ء میں، میں اس ڈیرے پر گیا۔اُس ڈیرے والے کا نام تھا حضرت سائیں فضل شاہ صاحبؒ۔نور والوں کا ڈیرہ اسے کہتے تھے۔چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں اس کی، اور اندر کچھ بھیڑ بکریاں، اور ایک بھینس بھی ہوتی تھی۔صفائی کا انتظام ایسا اچھا نہیں تھا، کیونکہ جب آدمی صفائی کی طرف توجہ دینے لگتا ہے تو باہر کی صفائی کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔اندر کی صفائی کی طرف کم ہو جاتی ہے۔خیر یہ میرے لیے ساری نئی باتیں تھیں۔آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس نوعیت کا، اور کس قسم کا ہوگا۔ہمارے بابا جی بے چارے تعلیم یافتہ نہیں تھے لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا، لیکن انہوں نے کہیں سے انگریزی کا لفظ نوٹ **Note** سیکھا ہوا تھا۔جب کوئی بات بہت خیال انگیز ہوتی تھی، نہایت **Thought provoking**، تو وہ انگلی اٹھا کے کہتے تھے نوٹ۔تو ہم سب چونک کر متوجہ ہو جاتے تھے کہ کوئی بات نہایت اہم ہوگی، اور ہم اسے سنبھال کر رکھیں اور یہ آئندہ زندگی میں کام آئے گی۔اسی طرح ان کے اردگرد جو لوگ تھے، ان کو بھی انہوں نے خطاب دے رکھے تھے ماڈرن قسم کے مثلاً وہاں پر ایک ڈاکٹر صاحب تھے اشرف فاضلی صاحب تو دوسرے جو اُن کی خط و کتابت کا کام کرتے تھے وہاں ڈاک آتی تھی، جو اس کا جواب دیتے تھے ان کو وہ سیکرٹری صاحب کہتے تھے۔جو حساب و کتاب پیسے ویسے لوگ دے جاتے تھے کھانے دانے کے تو ان کو وہ فنانس سیکرٹری کہتے تھے۔تو یہ لوگ بھی بڑے خوش ہوتے تھے کہ بیٹھے بٹھائے اتنے بڑے رتبے مل گئے ایک روز ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں بہت اچھی باتیں ہوتی ہیں اور بہت توجہ طلب باتیں ہوتی ہیں کیوں نہ یہاں سے ایک رسالہ نکالا جائے، اور وہ چھاپا جائے اور چھاپ کے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔بڑی اچھی بات تھی،

ایسے ہی ہوتا ہے۔تو ہم نے بیٹھ کے رسالے کی پوری ایک ڈمی تیار کی اس کا فارمیٹ سوچا، ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب اس کے ایڈیٹر قرار دیئے۔ سیکرٹری صاحب ظاہر ہے منتظم اعلیٰ وہی تھے میں نے کہا اچھا میں بھی کچھ لکھوں گا، سارا کچھ تیار کیا تو ہم یہ ساری سکیم بنا کے ان کی خدمت میں لے گئے۔ ہم نے کہا جی کہ ہم ایک رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا پہلے بھی ایک رسالہ نکلا یہاں سے تھوڑی دیر کے لیے پھر بند ہو گیا۔تو کہنے لگے، آپ رسالہ کیوں نکالنا چاہتے ہیں ؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا، اس لیے کہ ہم آپس میں اتحاد اور Unity پیدا کرنا چاہتے ہیں۔لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، اور ملیں گے، ان کو یہ Message جو ہے، یہ دور دور تک پہنچتا رہے گا اور استفادہ ہوگا ہماری بڑی آرزو ہے کہ مسلمان ایک ہوں، ان میں Unity ہو ان میں اتحاد ہو ان میں یکجہتی ہو۔تو آپ نے کہا: ''Note'' جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے صرف قوم کے اندر رہنے سے فرض اور حق پورا نہیں ہوتا کیونکہ اس ساری چیز کا تعلق قوم سے ہے اور عمل اس سے مختلف چیز ہے، اگر آپ جماعت بنانا چاہتے ہیں، اور آپ بھی اکثر سوچا کرتے ہیں، اور گھر میں بات بھی ہوتی ہے تو قول سے گفتگو سے کبھی نہیں ہوگی۔

دیکھیے ہمارا اللہ ایک ہے ہمارا رسولؐ ایک ہے ہمارا نماز پڑھنے کا طریقہ ایک ہے ہمارا قیامت کے اوپر ایمان ایک سا ہے، لیکن اس کے باوصف یک جہتی نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوچنے کی بات تھی تو ایسی باتیں بابوں کے ہاں سے ملتی ہیں کہ جب تک ایک دوسرے کا دکھ درد نہیں سنو گے ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانو گے، کون کس کیفیت سے گزر رہا ہے محض گفتگو کر دینے سے کام نہیں بنے گا۔ کہتے تھے Note جماعت عملاً ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے وجود میں آتی ہے خالی قول کے ساتھ جماعت کی یکجہتی کا حق ادا نہیں ہوتا آپ عمل مین داخل ہوں گے تو پھر یہ حق ادا ہوگا تو پھر یہ کام ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔ہم

اب بھی یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہ ایک کتاب رسالہ اخبار نکالتے ہیں اگر ہم ایک لیکچر دیں اگر پروفیسر جا کے سٹیج پر کھڑا ہو کر ایک بات بتا دے اور وہ سٹوڈنٹ کے ذہن میں اُتر جائے اس سے اُن کے اندر یکجہتی پیدا ہو جائے ایسا ہوتا نہیں۔ کبھی بھی نہیں ہوا۔ دنیا کے کسی خطے میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قول کی اہمیت نہیں ہے۔ کہی جانی والی بات کی اہمیت نہیں ہے یقیناً ہے۔ لیکن بابا جی فرماتے ہیں کہ Note قول ایک سواری ہے جو آپ کو عمل کے کنارے پر لے جاتی ہے۔ خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہم قول کی سواری کو اختیار کرتے ہیں اس کشتی میں بیٹھتے ہیں چپو چلاتے ہیں عمل کے کنارے پر پہنچتے ہیں لیکن اس کشتی کو چھوڑتے نہیں ہیں۔ اس کے اندر رہتے ہیں وہ وہیں چکر کاٹتی رہتی ہے عمل کا کنارا سامنے رہتا ہے اور ہم اس کی طرف جا نہیں رہے ہوتے اور ہم کوشش یہ کرتے ہیں پڑھے لکھے لوگ نوجوان میرے ساتھ ہیں ہم کوششیں صرف یہ کرتے ہیں کہ کمیونیکیشن سے صرف ڈائیلاگ سے صرف گفتگو سے بات بن جائے گی، کبھی نہیں بن سکتی۔ کیونکہ انسان کا وجود اس کی سائیکی اس کا ہونا اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ کوئی بندہ میری بات سنے اور میرے دکھ درد میں شریک ہو۔ یہ جو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا آج کل خودکشیاں ہو رہی ہیں لوگ خودسوزیاں کر رہے ہیں عام طور پر ایک اچھا جرنلسٹ یہی کہتا ہے کہ چونکہ ملازمتیں نہیں مل رہیں بھوک ننگ بہت ہے اس وجہ سے یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بات نہیں ہے اس وقت آپ کے پاکستان کا نوجوان خاص طور پر ایک آدمی اس کندھے کی تلاش میں ہے جس پر وہ اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ بیان کر سکے اور کوئی کندھا دینے کے لیے تیار نہیں کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ اگلے زمانے میں ہمارے زمانے میں ہمارے باپ دادا کے زمانے میں دکھ سکھ کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اُن کے پاس اکنامکس کے اتنے مسائل اور اتنی پرابلمز نہیں تھیں۔ ولایت والوں نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ دکھ سننے کے لیے

فیس لیتے ہیں۔ یہ سائیکاٹرسٹ جو ہوتے ہیں سائیکوتھراپسٹ جو ہوتے ہیں یہ آپ سے تین سوڈالر فی گھنٹہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں پرسوں پھر آ جانا تم اپنے دکھ بیان کرو مجھے پیسے دے دو۔ ہمارے ہاں بھی اب ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ اگر آپ لاہور کی نہر کے کنارے کنارے جائیں تو دو تین بورڈ آپ کو نظر آئیں گے ماہر نفسیات کے۔ جو یہ کہتے ہیں اگر آپ نے اپنا دکھ بیان کرنا ہے تو دوسو روپیہ گھنٹہ مجھے دیں دکھ اپنا بیان کر کے چلے جائیں تو وہ بھی ایک تھیراپی ہے لیکن پہلے زمانے میں ہمارے ہاں مفت اور عام ہوتی تھی۔ اب لوگ اتنے مصروف ہو گئے کہ کسی وجہ سے پھنس گئے تو جب تک عمل کے اندر آدمی داخل نہیں ہوگا دوسرے آدمی کو یقین نہیں آئے کہ یہ میرا کچھ لگتا ہے میرا کچھ بھائی بند ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے تقریر کر کے چلے جائیں گے تو اس کی انفرمیشن میں اضافہ ہو جائے گا اور خطرہ یہ ہے کہ وہ یہ ساری انفرمیشن سمیت کے ایک اگلے آدمی سے وہ بات کرنے لگ جائے گا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کبھی آپ نے ہمارے ٹیلی وژن کے پروگرام دیکھے ہیں دینی باتیں سوالوں کے جواب بڑی تیزی سے دیئے جاتے ہیں۔ وہ انفرمیشن ہوتی ہے اس کا ذات کے ساتھ اپنے وجود کے ساتھ یا اپنی سائیکی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تو آپ نے ہمیں منع کیا کہ دیکھیے ایسے نہ کریں رسالہ نہ چلائیں چھوڑیں اس کام کو کسی کے کام آسکتے ہیں تو وہ چھوٹا سا کام کریں۔ میں نے کہا جی کام، اب میں اتنا پڑھا لکھا آدمی جب میں بہت نوجوان تھا اور سوٹ پہنتا تھا تھری پیس اور سونے کی پن لگاتا تھا ٹائی میں۔ میں نے کہا میں کسی کے کیا کام آسکتا ہوں میں تو ایک معزز آدمی ہوں پروفیسر ہوں۔ کہنے لگے نہیں یقیناً آپ کام آسکتے ہیں۔ کہنے لگے یہاں اماں جی رہتی ہیں۔ وہاں صابن کی کچھ دکانیں تھیں وہاں پر ایک مائی تھی دائی کا وہ کام کرتی تھی۔ تو اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ تو کہنے لگے اس کی بیٹی کی شادی ہے اور اس کا جو منگیتر ہے اماں نے لڑکا چنا ہے۔ وہ سگنلر ہے بابا جی نے پتا

نہیں لفظ کہاں سے سیکھا، سگنلر وہ ہوتا ہے جو موری کے اوپر تار باندھے کہنے لگے وہ سگنلر ہے محکمہ ڈاک بنگلہ میں۔ ڈاک بنگلہ نہر کا بنگلہ۔ انگریز کے زمانے میں یہاں ریل تار ڈاک کا انتظام بہت غضب کا تھا۔ جب یہ نہریں کھودیں انہوں نے ان کے کنارے بڑے اعلیٰ درجے کے بنگلے بنوائے بچ ٹریز والے بنگلے ان میں فلمیں بھی بڑی شوٹ ہوتی تھیں اعلیٰ درجے کی اس کے اندر بلڈنگیں ہوتیں تھیں، اور وہاں پر ایک آفس بھی ہوتا تھا جہاں پر سگنلر کنڈکٹر تھا خدانخواستہ اگر نہر میں کوئی خرابی ہو پانی روکنا ہو یا کوئی اور کھٹا کھٹ ہو۔ تو وہ سگنلر کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے۔ 60 روپے تنخواہ والا سگنلر ۔ وہ لڑکا بھی پسند کر لیا تھا۔ تو مجھے کہنے لگے تمہارے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے وہ سیکلیلر کا ابا جو ہے وہ آ رہا ہے تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے لڑکی کتنا کام کرتی ہے چار پائیوں کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھتی ہے کہ نہیں شام کو بسترے بچھاتی ہے کہ نہیں گھڑا پانی کا بھر کے لاتی ہے کہ نہیں تو وہ وہاں رہے گا کچھ دن وہ جو روٹی کھاتا ہے وہ گندم اور مکئی کا آٹا ملا کے کھاتا ہے اب نخرہ دیکھیں اس کا۔ تو تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ تم دس سیر پکا مکئی کا آٹا اپنی موٹر میں رکھ کر اماں جی کے پاس پہنچاؤ۔ میں نے کہا مجھے کوئی اچھا سا کام دیں لکھنے کا یہ کیا ہے۔ مجھے کہنے لگے، وہ اس لیے دینا ہے کہ ہم نے اس بابے کی عزت افزائی کرنی ہے اور ہماری بیٹی کی شادی ہے۔ تو میں نے کہا اچھا جی تو میں گیا بھی اس سے ملا بھی بابے سے انہوں نے کہا، خبردار اس کی بہت عزت کرنی ہے، اور اس کو سلام کرنا ہے۔ میں نے کہا جی میں دو مرتبہ کرنے کو تیار ہوں۔ جب میں لوٹ کے آیا اگلے دن۔ تو کہنے لگے وہ حقہ پیتا ہے تو میں نے کیکر کی چھال جو ہے نا جس کو کیکر کے سکڑے کہتے ہیں تو اس کا کوئلہ بہت اچھا ہوتا ہے اور جو پرانے بابے حقہ تمبا کو پینے والے ہیں۔ اس کی آگ دھرتے ہیں تو یہ سکڑے جو ہیں یہ تھے سیر ڈیڑھ یہ انہیں دے دو۔ میں نے کہا، جی دفع کریں چپا سا آدمی ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں نہیں، یہ نہیں کہنا۔ وہ اللہ کی مخلوق

ہے،اور وہ انبیا کا بیٹا ہے۔ میں نے کہا وہ بندہ۔ کہنے لگے،ہاں حضرت آدم کی اولاد جو ہے۔ اچھا وہ ہر ایک کو کہتے تھے کہ بنی کا بیٹا ہے تو ہماری برکت ہوگی لو جی یہ نبی کی دھی ہمارے ڈیرے پر آ گئی ہے۔ خیر ہمارے لیے یہ بات سیکھنی بہت مشکل تھی ،تو جب انہوں نے یہ ڈیوٹی لگائی ہم بہت روئے پیٹے کہ رسالہ چلنے سے رہ گیا۔

امریکہ سے کوئی صاحب آئے انہوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ اشفاق صاحب! میں پتا نہیں کتنے ملین ڈالر اکیس برس امریکہ رہنے کے بعد کما کر لایا ہوں، میں نے اسلام آباد میں کچھ کام شروع کیا ہے اسلام یک جہتی اور ملک وقوم کی خدمت کرنے کے لیے،تو آپ آئیں۔تو میں نے کہا سنئیں آپ جو بھی کریں گے ٹھیک ہوگا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے کیا کروں گا۔ میں آپ کو کوئی اچھا سا تجھاؤ نہیں دے سکتا۔ کہنے لگے نہیں آپ ضرور آئیں۔تو میں نے ٹیلی فون پر ان سے کہا دیکھیے آپ ایک بہت بڑی ساری بلڈنگ بنائیں گے، پھر اس میں آپ ایک سیکشن رکھیں گے اس میں درسِ قرآن شروع کریں گے پھر تجوید کا رکھیں گے پھر آپ قرآت سکھائیں گے،بس یہی چیزیں ہوں گی۔ یہ آپ کرتے رہیں،اچھی بات ہے لیکن وہ جو آپ کی آرزو ہے کہ لوگ جو ہیں وہ ایک جماعت کا رخ اختیار کریں تو وہ عملاً کرنے سے کام ہوگا اور رسالہ چھاپنے سے نہیں ہوگا۔اب بھی جو دینی جماعتیں ہیں وہ بار بار یہی کہتی ہیں،آپ نے دیکھا ہوگا بے شمار لوگ آپ کے پاس بھی آتے ہیں،کتابیں آتی ہوں گی شاید، بڑی اچھی بات ہے۔ وہ کشتی ضرور ہے وہ ساحل تک ضرور لے جاتی ہے لیکن ساحل پر خود اس کو اُترنا پڑے گا،اب ہمارے لیے یہ بات بڑی مشکل ہوگئی کہ یہ کیسے کریں؟ کہ ہم اس کو چھوڑ کر عمل کی طرف آئیں۔ انہوں نے کہا اگر Unity چاہتے ہیں آپ ،اتحاد چاہتے ہیں،تو پھر آپ کو عمل کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ ایسے کام نہیں بنے گا۔

ایک مرتبہ ہم لاری پر جوہرآباد جارہے تھے، بڑی دیر کی بات ہے میرے ساتھ لاری میں ایک اور معزز آدمی پرانی وضع کے ریٹائرڈ تھے، گرمی بہت تھی انہوں نے پگڑی رکھی ہوئی تھی گود میں۔ ہوا آرہی تھی۔ تو ایک خاص علاقہ آیا، تو انہوں نے پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی، اور اَدب سے بیٹھ گئے تو میں متجسس آدمی تھا۔ میں نے کہا: ''جی یہاں کسی بزرگ کا مزار ہے'' کہنے لگے: ''نہیں'' میں نے کہا: ''جی کوئی درگاہ ہے یہاں'' کہنے لگے: ''نہیں'' تو میں نے کہا: ''معاف کیجیے گا، میں نے یہ دیکھا ہے کہ آپ نے پگڑی جو ہے وہ گود سے اٹھا کر سر پر رکھ لی ہے تو باادب ہو کے بیٹھ گئے ہیں کوئی وجہ تو ہوگی'' کہنے لگے: ''بات یہ ہے کہ میں اس علاقے کا واقف ہوں، یہاں ڈیزرٹ تھا، اور ریت تھی، اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تو حکومت نے سوچا کہ اس میں کوئی فصل اُگائی جائے۔ تو لوگ آتے نہیں تھے ایک آدمی آیا اس نے آ کر جھونپڑا بنایا، اور جھونپڑا بنا کر یہاں پانی کی تلاش میں ٹیوب ویل وغیرہ سنک کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے یہاں سبزہ اُگایا جس نے عملی صورت میں اس زمین کو ہریالی بخشی، تو میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں، پتا نہیں وہ آدمی کہاں ہو، میں نے اس کے احترام میں یہ پگڑی اُٹھا کے رکھ لی'' دیکھیے یہ ایسی چیزیں ہیں، جو ہماری زندگی کے اوپر عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں، اور اگر آپ اپنی آنکھیں بالکل کھلی رکھیں (حاضرین کی بھنبھناہٹ) ماشاءاللہ کھلی رکھتے ہیں، کان بھی، تو آپ کو اردگرد اتنی کہانیاں ملیں گی، جن کے اوپر آپ نے اس سے پہلے توجہ نہیں دی ہوگی۔ ہمارے استاد تھے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب تو ہم سیانے تھے۔ میں ففتھ ایئر میں پڑھتا تھا اُن کی ایک عادت تھی کہ جب کسی کی شادی ہوتی تھی نا، لڑکی کے گھر والوں میں، تو ان کے گھر جا کر بارات کو کھانا کھلانے کا بندوبست ان کے سر پر ہوتا تھا۔ تو صوفی صاحب نے ہم کو کہا کہ چلو بھئی فلاں گھر میں کھانا برتانا ہے، دینا ہے، بارات آ گئی ہے۔ مجھے یاد ہے ہم بھاٹی دروازے بتیاں والی

سرکار کے پیچھے ایک گھر تھا، وہاں چلے گئے۔ انہوں نے کہا: "لو جی صوفی صاحب آ گئے فکر کی کوئی بات نہیں" نائی دیگیں لے آئے۔ اب جو بارات تھی اس کے بارے خیال تھا کہ 80 کے قریب بندے ہوں گے۔ وہ 160 کے قریب آ گئے۔ اب صوفی صاحب کی آنکھیں، اگر آپ میں سے کسی کو یاد ہیں ماشاءاللہ بہت موٹی تھیں۔ گھبرا گئے اور ان کے ماتھے پر پسینا اور ناک پر بھی آ جاتا تھا۔ کہنے لگے: "اشفاق! ہن کیہہ کریئے" میں نے کہا: "پتا نہیں، دیگوں میں پانی ڈال دیتے ہیں" پہلا موقع تھا۔ میں 5th Year کا سٹوڈنٹ تھا۔ انہوں نے ایک تھپڑ مارا میرے منہ پر۔ زور سے۔ کہنے لگے: "بیوقوف آدمی اس میں پانی ڈال کے مرنا ہے۔ وہ تو فوراً ختم ہو جائے گا۔ اس میں گھی کا پیپا ایک اور ڈالنا ہے۔ گاڑھا ہو جائے گا تو کھایا نہیں جاتا" اب ہم اندر سروے کر رہے تھے، اور صوفی صاحب بیچ میں سے نکال کے ڈالتے جاتے تھے۔ ہم باراتیوں سے کہتے اور لائیں۔ وہ کہتے تھے گرم لاؤ جی۔ ہم تو بھاگے پھرتے تھے۔ اب آخر کیفیت یہ آ گئی کہ دیگیں ختم ہو گئیں اور ان کا چہرہ دیکھنے والا تھا وہ کانپ رہے تھے۔ اگر کسی نے اندر سے کہہ دیا کہ اور رقاب بھیجیں، تو ان کے پاس دینے کے لیے صرف ایک رہ گئی تھی، لیکن وہ ڈرے ہوئے تھے۔ جب خوفزدہ تھے تو اندر سے آواز آئی بس۔ جب دوسرے بندے نے کہا، بس جی صوفی صاحب۔ تو صوفی صاحب کے ہاتھ میں جو کپڑا ہوتا تھا وہ گرا، اور اتنی شدت سے پیچھے گرے کہ وہ بڑا سا کڑھاؤ تھا، شکر ہے، ان کے سر پر نہیں لگا تو ہم نے اُٹھا کر اُن کو بستر پر لٹایا، اور ٹانگیں پاؤں دبائے۔ جب تلی مالش کی اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا: "خدا کے واسطے ایسی ٹینشن کا کام آئندہ نہیں کرنا" کہنے لگے: "نہیں بالکل نہیں میری بھی توبہ" وہاں سے ہم چل پڑے، پیچھے ہم شاگرد۔ اب آگے آگے صوفی صاحب، کوئی پندرہ بیس گز سے زیادہ گئے ہوں گے۔ ایک مائی باہر نکلی، کہنے لگی: "لو غلام مصطفیٰ میں تے تینوں لبھدی پھرنی آں، تاریخ رکھ دتی اے۔



تیرہ بھادوں دی کا کی دی'' تو صوفی صاحب جو توبہ کر کے نکلے، کہنے لگے: ''کاغذ ہے، ہاں پنسل ہے'' کہنے لگے: ''ہاں۔ لکھ تیرہ سیر گوشت اِک بوری چول'' صوفی صاحب لکھوا رہے ہیں۔ تو میں نے کہا: ''جی یہ پھر ہو گا'' کہنے لگے: ''نہیں یہ تو ان کی ضرورت ہے'' میں نے کہا: ''آپ صرف پڑھایا کریں کتاب کی تشریح وغیرہ'' تو یہ اُن کا کام تھا، تو یہ جو عمل کی دنیا ہے اس میں داخل ہونا ضروری ہے۔

عالم لوگ پڑھے لکھے میرے جیسے پروفیسر بات کرنے والے، ایڈیٹوریل لکھنے والے کہتے ہیں گفتگو اگر ہوتی رہے، اگر اس طرح کا مواد چھپتا رہے تو لوگ ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ جب میں بہت تنگ آجاتا تھا، کبھی لاڈ میں ہوتا تھا۔ تو میں پوچھتا تھا ان سے کہ بابا جی یہ بتائیں کہ دین کیا ہوتا ہے اسلام کیا ہوتا ہے مومن کیا ہوتا ہے؟ تو میں نے ایک دن پوچھا ان سے۔ میں نے کہا: ''جی بابا جی بتائیں کہ مسلمان کون ہوتا ہے؟'' کہنے لگے: ''مسلمان وہ ہوتا ہے۔ جس کا دل صاف ہو، اور ہاتھ گندے ہوں'' میں نے کہا: ''حضور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی'' کہنے لگے: ''جو بھائیوں کے کام کرتا رہے گا اس کے ہاتھ تو گندے ہوں گے، جو آرام سے بیٹھا ہو گا دستانے پہن کے اس کا تو کچھ نہیں خراب ہونا ہے۔ تو مسلمان وہ ہوتا ہے جو اُس کا گارا لگاتا ہے، اُس کی اینٹ اُٹھاتی ہے، اُس کے لیے لکڑیاں لا کر دیتی ہیں جو روتا ہے اس کے آنسو پونچھتے ہیں۔ وہ ہوتا ہے مسلمان'' ہم کو تو ایسی Defination کسی کتاب میں نہیں ملتی ہے یہ اُن کے پاس بیٹھنے سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے ایسی چیزیں ملتی ہیں تو اب عمل میں داخل ہونے کے لیے کیا کچھ کیا جائے، کیسے کیا جائے، یا یہ بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ گفتگو بڑی آسان ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں، احسن صاحب، ٹیلی کمیونیکیشن کے چیف انجینئر ہیں۔ وہ کہتے ہیں جتنی بھی فارن کالز ہوتی ہیں، ان میں اکثر لوگ یہی کہہ رہے ہوتے ہیں

کہ: ''ہور سناؤ کیہ حال اے'' ہور سناؤ جی کہتا رہتا ہے آدمی۔ یا زیادہ سے زیادہ موسم کا حال پوچھتا ہے۔ تو کہنے لگے اگر ان ٹرنک کال میں سے لانگ ڈسٹنس کالز میں سے ''ہور سناؤ کیہ حال اے'' کو جمع کیا جائے اور جتنا ٹائم وہ بنتا ہے، اس ٹائم کے اندر ساڑھے تین میل لمبی سرنگ کھودی جا سکتی ہے۔ وہ عمل میں ٹرانسلیٹ کر رہے ہیں نا اس کو۔ تو اب یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ نے دین کو کس حساب سے اختیار کرنا ہے۔ بابے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہوں اور اپنے ہاتھ گندے رکھو، اور دل اپنا صاف ستھرا رکھو، پھر تو مزہ ہے، پھر Unity ہوگی، کہے بغیر۔ لکھے بغیر۔ یہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کرنے سے ہوتا ہے، اور اُن کے قریب جانے سے ہوتا ہے اُن کی دکھ درد کی کہانی سننے سے ہوتا ہے۔ نہ بھی کچھ کر سکیں تو ایک کان ضرور اُن کے ساتھ لگا کر بیٹھیں، ان کو بڑی ضرورت ہے، سارے اس بات کے لیے تقاضا کر رہے ہیں کہ آئیں، اور ہمارے پاس بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔



موضوع

زندگی کے اسرار

منظر: اشفاق صاحب سفید شال، شلوار کرتا اور نیلا سویٹر پہنے صوفے سے ٹیک لگائے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

مہمان: فوزیہ تبسم (براڈ کاسٹر، کمپیئر، پلے رائٹر اور افسانہ نگار)



زندگی کے اِسرار

ماں خدا کی نعمت ہے اور اس کے پیار کا انداز سب سے الگ اور نرالا ہوتا ہے۔ بچپن میں ایک بار بادوباراں کا سخت طوفان تھا اور جب اس میں بجلی شدت کے ساتھ کڑکی تو میں خوفزدہ ہو گیا۔ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میری ماں نے میرے اوپر کمبل ڈالا اور مجھے گود میں بٹھالیا تو محسوس ہوا گویا میں امان میں آ گیا ہوں۔ میں نے کہا: ''اماں! اتنی بارش کیوں ہو رہی ہے؟'' اس نے کہا: ''بیٹا! پودے پیاسے ہیں۔ اللہ نے انہیں پانی پلانا ہے اور اسی بندوبست کے تحت بارش ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا: ''ٹھیک ہے! پانی تو پلاتا ہے لیکن یہ بجلی کیوں بار بار چمکتی ہے؟ یہ



اتنا کیوں کڑکتی ہے؟'' وہ کہنے لگیں: ''روشنی کر کے پودوں کو پانی پلایا جائے گا۔ اندھیرے میں تو کسی کے منہ میں تو کسی کی ناک میں پانی چلا جائے گا۔اس لیے بجلی کی کڑک چمک ضروری ہے۔''

میں ماں کے سینے کے ساتھ لگ کر سو گیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ بجلی کس قدر چمکتی رہی یا نہیں ۔ یہ ایک بالکل چھوٹا سا واقعہ ہے اور اس کے اندر پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ یہ ماں کا فعل تھا جو ایک چھوٹے سے بچے کے لیے جو خوفزدہ ہو گیا ہے، اُسے خوف سے بچانے کے لیے پودوں کو پانی پلانے کی مثال دیتی ہے۔ یہ اس کی ایک اپروچ تھی۔ گو وہ کوئی پڑھی لکھی عورت نہیں تھیں ۔ دولت مند بہت عالم فاضل کچھ بھی ایسا نہیں تھا لیکن وہ ایک ماں تھی۔ میں جب نو سال کا ہوا تو میرے دل میں ایک عجیب خیال پیدا ہو کہ سرکس میں بھرتی ہو جاؤں اور کھیل پیش کروں، کیونکہ ہمارے قصبے میں ایک بہت بڑا میلا لگتا تھا۔ تیرہ چودہ پندرہ جنوری کو اور اس میں بڑے بڑے سرکس والے آتے تھے۔ مجھے وہ سرکس دیکھنے کا موقع ملا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ جب میں نے اپنے گھر میں اپنی یہ خواہش بیان کی کہ میں سرکس میں اپنے کمالات دکھاؤں گا، تو میری نانی ''ہچا'' کر کے ہنسی اور کہنے لگیں: ''ذرا شکل تو دیکھو! یہ سرکس میں کام کرے گا۔'' میری ماں نے بھی کہا: ''دفع کر تو بڑا ہو کر ڈپٹی کمشنر بنے گا۔ تو نے سرکس میں بھرتی ہو کر کیا کرنا ہے۔'' اس پر میرا دل بڑا بجھ سا گیا۔ وہی ماں جس نے مجھے اتنی محبت سے اس بادو باراں کے طوفان میں امان اور آسائش عطا کی تھی۔ وہ میری

خواہش کی مخالفت کر رہی تھی۔

میرے والد سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، کیوں نہیں؟ اگر اس کی صلاحیت ہے تو اسے بالکل سرکس میں ہونا چاہیے۔ تب میں بہت خوش ہوا۔ اب ایک میری ماں کی مہربانی تھی۔ ایک والد کی اپنی طرف کی مہربانی۔ انہوں نے صرف مجھے اجازت ہی نہیں دی، بلکہ ایک ڈرم جو ہوتا ہے۔ تارکول کا اس کو، کالا، نیلا اور پیلا پینٹ کر کے بھی لے آئے اور کہنے لگے اس پر چڑھ کر آپ ڈرم کو آگے پیچھے رول کیا کریں۔ اس پر آپ کھیل کریں گے تو سرکس کے جانباز کھلاڑی بن سکیں گے۔ میں نے کہا منظور ہے۔

چنانچہ میں اس ڈرم پر پریکٹس کرتا رہا۔ میں نے اس پر اس قدر اور اچھی پریکٹس کی کہ میں اس ڈرم کو اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کہیں بھی لے جا سکتا تھا۔ گول چکر کاٹ سکتا تھا۔ بغیر پیچھے دیکھے ہوئے آگے پیچھے آ جا سکتا تھا۔ پھر میں نے اُس ڈرم کے اوپر چڑھ کر ہاتھ میں تین گیندیں ہوا میں اُچھالنے کی پریکٹس کی۔ وہاں میرا ایک دوست تھا۔ ترکھانوں کا لڑکا محمد رمضان۔ اس کو بھی میں نے پریکٹس میں شامل کر لیا۔ وہ اچھے چھریرے بدن کا تھا، وہ مجھ سے بھی بہتر کام کرنے لگا۔ بجائے گیندوں کے وہ تین چھریاں لے کر ہوا میں اچھال سکتا تھا۔ ہم دونوں ڈرم پر چڑھ کر اپنا یہ سرکس لگاتے۔ ایک ہماری بکری تھی اس کو بھی میں نے ٹرینڈ کیا۔ وہ بکری بھی ڈرم پر آسانی سے چڑھ جاتی۔



ہمارا ایک ''دبشی'' نامی کتا تھا وہ لمبے بالوں والا روسی نسل کا تھا۔ اس کو ہم نے کافی سکھایا لیکن وہ نہ سیکھ سکا۔ وہ یہ کام ٹھیک سے نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ کتا کافی ذہین ہوتا ہے۔ وہ بھونکتا ہوا ہمارے ڈرم کے ساتھ بھاگتا تھا مگر اوپر چڑھنے سے ڈرتا تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا کہ یہ کتا ہماری سرکس ہی کا ایک حصہ ہے لیکن یہ جوکر کتا ہے اور یہ کوئی کھیل نہیں کر سکتا صرف جوکر کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ خیر! ہم یہ کھیل دکھاتے رہے۔ ہم اپنا شو کرتے تو میرے ابا جی ہمیشہ ایک روپیہ والا ٹکٹ لے کر کرسی ڈال کر ہماری سرکس دیکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ ہمارا ایک ہی تماشائی ہوتا تھا اور کوئی بھی دیکھنے نہیں آتا تھا۔ صرف ابا جی ہی آتے تھے۔ ہم انہیں کہتے کہ آج جمعرات ہے۔ آپ سرکس دیکھنے آیئے گا۔ وہ کہتے میں آؤں گا۔ وہ ہم سے ایک روپے کا ٹکٹ بھی لیتے تھے جو ان کی شفقت کا ایک انداز تھا۔

زندگی میں کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے اور آپ اس بات کو مائنڈ نہ کیجیے گا۔ اگر آپ کو روحانیت کی طرف جانے کا بہت شوق ہے تو اس بات کو برا نہ سمجھئے گا کہ بعض اوقات ماں باپ کے اثرات اس طرح سے اولاد میں منتقل نہیں ہوتے جس طرح سے انسان آرزو کرتا ہے۔ اس پر کسی کا زور بھی نہیں ہوتا۔ ٹھیک چوالیس برس بعد جب میرا پوتا جو بڑا اچھا بڑا ذہین لڑکا اور خیر و شر کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے وہ جاگنگ کر کے گھر میں واپس آتا ہے تو اس کے جوگر جو کیچڑ میں لتھڑے ہوتے ہیں وہ اُن کے ساتھ اندر گھس آتا ہے اور وہ ویسے ہی خراب جوگروں کے ساتھ چائے

بھی پیتا ہےاور سارا قالین کیچڑ سے بھر دیتا ہے۔ میں اب آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے لگا ہوں کہ میں اسے برداشت نہیں کرتا تھا کہ وہ خراب، کیچڑ سے بھرے جوگروں کے ساتھ قالین پر چڑھے۔ میرا باپ جس نے مجھے ڈرم لا کر دیا تھا میں اسی کا بیٹا ہوں اور اب میں پوتے کی اس حرکت کو برداشت نہیں کرتا۔ دیکھئے یہاں کیا تضاد پیدا ہوا ہے۔ میں نے اپنے پوتے کو بہت شدت کے ساتھ ڈانٹا اور جھڑکا کہ تم پڑھے لکھے لڑکے ہو تمہیں شرم آنی چاہیے کہ یہ قالین ہے برآمدہ ہےاور تم اسے کیچڑ سے بھر دیتے ہو۔ اس نے کہا: ''دادا آئی ایم ویری سوری!! میں جلدی میں ہوتا ہوں، جوگر اُتارنے مشکل ہوتے ہیں۔ امی مجھے بلا رہی ہوتی ہیں کہ **have a cup of tea** تو میں جلدی میں ایسے ہی اندر آ جاتا ہوں۔'' میں نے کہا کہ تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیے۔ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرو چنانچہ میں اس پر کمنٹس کرتا رہا۔ ٹھیک ہے مجھے ایک لحاظ سے حق تو تھا لیکن جب یہ واقعہ گزر گیا تو میں نے ایک چھوٹے سے عام سے رسالے میں اقوالِ زرّیں وغیرہ میں ایک قول پڑھا کہ ''جو شخص ہمیشہ نکتہ چینی کے موڈ میں رہتا ہےاور دوسروں کے نقص نکالتا ہے وہ اپنے آپ میں تبدیلی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔'' انسان کو خود یہ سوچنا چاہیے کہ جی مجھ میں فلاں تبدیلی آنی چاہیے جی میں سگریٹ پیتا ہوں، اسے چھوڑنا چاہتا ہوں، یا میں صبح نہیں اُٹھ سکتا میں اپنے آپ کو اس حوالے سے تبدیل کرلوں۔ ایک نکتہ چیں میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی ذات کی جو بیڑی ہے وہ کمزور ہونے لگتی ہے۔



آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب سیل کمزور ہو جائیں تو ایک بیٹری کا بلب ذرا سا جلتا ہے پھر بجھ جاتا ہے۔ اسی طرح کی کیفیت ایک نکتہ چیں کی ہوتی ہے۔ میں نے وہ قول پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ میری نکتہ چینی اس لڑکے پر ویسی نہیں ہے۔ جیسا کہ میرے باپ کی ہو سکتی تھی۔ میرے باپ نے سرکس سیکھنے کی بات پر مجھے نہیں کہا کہ عقل کی بات کر تو کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے مجھے یہ کہنے کے بجائے ڈرم لا کر دیا اور میری ماں نے مجھے بادوباراں کے طوفان میں نہیں کہا کہ چپ کر ڈرنے کی بات کیا ہے؟ اور میں نے دیکھا کہ میرے پوتے کی ماں (میری بہو) بازار سے تار سے بنا ہوا میٹ لے آئی اور اس کے ساتھ ناریل کے بالوں والا ڈور میٹ بھی لائی، تا کہ اس کے ساتھ پیر گھس کے جائے اور اندر کیچڑ نہ جانے پائے۔ سو یہ فرق تھا مجھ میں اور اس ماں میں۔ میں نکتہ چینی کرتا رہا اور اس نے حل تلاش کر لیا۔

جب آپ زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور باطن کے سفر کی آرزو کرتے ہیں تو جب تک آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال نہ کریں گے اور بڑے میدان تک پہنچنے کے لیے پگڈنڈی نہ تیار کریں گے وہاں نہیں جا سکیں گے۔ آپ ہمیشہ کسی ''بابے'' کی بابت پوچھتے رہتے ہیں۔ ہمارے بابا جی سے فیصل آباد سے آنے والے صاحب نے بھی یہی پوچھا اور کہنے لگے کہ سائیں صاحب! آپ کو تو ماشاءاللہ خداوند تعالیٰ نے بڑا درجہ دیا ہے۔ آپ ہم کو کسی قُطب کے بارے میں بتلا دیں۔ بابا جی نے اُن کی یہ بات نظر انداز کر دی۔ وہ صاحب پھر کسی وقت کے قطب بارے دریافت کرنے لگے۔

جب انہوں نے تیسری بار بھی پوچھا تو باباجی نے اس سے کہا کہ کیا تم نے اس کو قتل کرنا ہے؟

آدمی کا شاید اس سے یہی مطلب یا مقصد ہوتا ہے کہ کوئی بابا ملے اور میں اس کی غلطیاں نکالوں۔ اگر روح کی دنیا کو ٹٹولنے کا کوئی ایسا ارادہ ہو یا اس دنیا میں کوئی اونچی پکار کرنے کی خواہش ہو کہ "میں آ گیا" تو اس کے لیے ایک راستہ متعین ہونا چاہیے تیاری ہونی چاہیے۔ تبھی انسان وہاں تک جا سکتا ہے۔ ہم ڈائریکٹ کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔ آپ کو اس دنیا کے اندر کوئی پیراشوٹ لے کر نہیں جائے گا۔ جب یہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں رونما ہوں گی، تو جا کر کہیں بات بنے گی۔

میرے بھائی نے ایک بار مجھ سے کہا کہ اگر آپ نے کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرنا ہے تو میرے پاس آ کر مہینے دو گزار لیں۔ اُن کا ریناله خورد میں ایک مرغی خانہ ہے میں وہاں گیا، بچے بھی ساتھ تھے۔ وہاں جا کر تو میری جان بڑی اذیت میں پھنس گئی ۔ وہ اچھی سرسبز جگہ تھی ۔نہر کا کنارہ تھا لیکن وہ جگہ میرے لیے زیادہ Comfortable ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ آسائشیں میسر نہیں تھیں۔ ایک تو وہاں مکھیاں بہت تھیں دوسرے مرغی خانے کے قریب ہی اصطبل تھا وہاں سے گھوڑوں کی بو آتی تھی۔ تیسرا وہاں پر مشکل یہ تھی کہ وہاں ایک چھوٹا فریج تھا اس میں ضرورت کی تمام چیزیں نہیں رکھی جا سکتی تھیں اور بار بار بازار جانا پڑتا تھا۔ یہ مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا۔

اب دیکھئے خدا کی کیسی مہربانی ہوتی ہے۔ وہی مہربانی جس کا میں آپ سے اکثر ذکر کرتا ہوں۔ میں اصطبل میں یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ اس کی بو روکنے کے لیے کسی دروازے کا بندوبست کیا جا سکے۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے تینوں بچے گھوڑوں کو دیکھنے کے لیے اصطبل کے دروازے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ صبح جاگتے تھے تو سب سے پہلے آ کر گھوڑوں کو دیکھتے۔ انہیں گھوڑوں کے ساتھ اتنا عشق ہو گیا تھا۔ ان میں ایک گھوڑا ایسا تھا جو بڑا اچھا تھا۔ وہ انہیں ہمیشہ ہنہنا کر ہنساتا تھا اور اگر وہ بیٹے، میرے بچے وقت پر نہیں پہنچتے تھے تو شاید انہیں بلاتا تھا۔ اس گھوڑے کی ہنہناہٹ سے یہ اندازہ ہوتا تھا۔ اب میں نے کہا کہ نہیں یہ خوشبو یا بدبو اصطبل اور گھوڑے اور ان بچوں کی دوستی مجھے وارے میں ہے اور اب مجھے یہ گھوڑے پیارے ہیں۔ بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔ ہم شہر کے صفائی پسند لوگ جو مکھی کو گوارہ نہیں کرتے۔

ایک بار میرے دفتر میں میرے بابا جی، سائیں صاحب تشریف لائے تو اس وقت میرے ہاتھ میں مکھیاں مارنے والا فلیپ تھا۔ مجھے اس وقت مکھی بڑی تنگ کر رہی تھی۔ میں مکھی مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے مجھے بابا جی کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اچانک ان کی آواز سنائی دی۔ وہ کہنے لگے یہ اللہ نے آپ کے ذوق کشتن کے لیے پیدا کی ہے۔ میں نے کہا جی یہ مکھی گند پھیلاتی ہے اس لیے مار رہا تھا۔ کہنے لگے یہ انسان کی سب سے بڑی محسن ہے اور تم اسے مار رہے ہو۔ میں نے کہا جی مکھی کیسے محسن ہے؟ کہنے لگے یہ بغیر کوئی کرایہ لے بغیر کوئی ٹیکس لیے انسان کو یہ بتانے

آتی ہے کہ یہاں گند ہے۔ اس کو صاف کر لو تو میں چلی جاؤں گی اور آپ اسے مار رہے ہیں۔ آپ پہلے جگہ کی صفائی کر کے دیکھیں یہ خود بخود چلی جائے گی۔ سو وہاں بابا جی کی کہی ہوئی وہ بات میرے ذہن میں لوٹ کر آئی اور میں نے سوچا کہ مجھے اس کمرے میں کوئی فریش چیزیں پھول یا سپرے وغیرہ رکھنی چاہیں اور یہاں کی صفائی پر دھیان دینا چاہیے۔ وہ فرش جیسا بھی تھا اس کو گیلا کر کے میں نے جھاڑو لے کر خود خوب اچھی طرح سے صاف کیا۔ آپ یقین کریں پھر مجھے مکھیوں نے تنگ نہیں کیا۔

جب میں سودا لینے کے لیے، جس سے میں بہت گھبراتا ہوں ایک میل کے فاصلے پر بازار گیا تو میں نے وہاں اپنے بچپن کے کئی سال گزارنے کے بعد بساطیوں کی دکانیں دیکھیں جو ہمارے بڑے شہروں میں نہیں ہوتیں۔ وہاں پر میں نے بڑی دیر بعد دھونکنی کے ساتھ برتن قلعی کرنے والا ایک بندہ دیکھا پھر عجیب بات جس سے آپ سارے لوگ محروم ہیں اور آپ نہیں جانتے کہ وہاں ایک کسان لڑکا دیکھا جو گندم کے باریک "ناڑ" جو تقریباً چھ انچ لمبا تھا اسے کاٹ کر اس کے ساتھ الغوزہ بجاتا تھا۔ وہ اتنا خوبصورت الغوزہ بجاتا تھا کہ اگر آپ اسے سننے لگیں تو آپ بڑے بڑے اُستادوں کو بھول جائیں۔ پھر میں آرزو کرنے لگا کہ مجھے ہر شام بازار جانے کا موقع ملے۔ یہ چیزیں بہت چھوٹی ہیں اور بظاہر یہ معمولی لگتی ہیں لیکن ان کی اہمیت اپنی جگہ بہت زیادہ ہے۔

اگر آپ معمولی باتوں کی طرف دھیان دیں گے اگر آپ اپنی کنکری کو بہت



دُور تک جھیل میں پھینکیں گے تو بہت بڑا دائرہ پیدا ہو گا لیکن آپ کی آرزو یہ ہے کہ آپ کو بنا بنایا بڑا دائرہ کہیں سے مل جائے اور وہ آپ کی زندگی میں داخل ہو جائے ایسا ہوتا نہیں ہے۔ قدرت کا ایک قانون ہے کہ جب تک آپ چھوٹی چیزوں پر معمولی باتوں پر جو آپ کی توجہ میں کبھی نہیں آئیں اپنے بچے پر اپنے بھانجے پر اور اپنی بھتیجی پر آپ جب تک اس کی چھوٹی سی بات کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے تو آپ کو دنیا کی کوئی چیز یا دولت خوشی عطا نہیں کر سکے گی، کیونکہ روپیہ آپ کو خوشی عطا نہیں کر سکتا۔ روپے پیسے سے آپ کوئی کیمرہ خرید لیں خواتین کپڑے خرید لیں اور وہ چیزیں خریدتی چلی جاتی ہیں کہ یہ ہمیں خوشی عطا کریں گی۔ لیکن جب وہ چیز گھر میں آجاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت گھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔

خوشی تو ایسی چڑیا ہے جو آپ کی کوشش کے بغیر آپ کے دامن پر اُتر آتی ہے۔ اس کے لیے آپ نے کوشش بھی نہیں کی ہوتی، تیار بھی نہیں ہوئے ہوتے، لیکن وہ آجاتی ہے۔ گویا اس رُخ پر جانے کے لیے جس کی آپ آرزو رکھتے ہیں جو کہ بہت اچھی آرزو ہے کیونکہ روحانیت کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا مگر جب تک اسے تلاش نہیں کرے گا جب تک وہ راستہ یا پگڈنڈی اختیار نہیں کرے گا اس وقت تک اسے اپنے مکمل ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ انسان یہ کوشش کرتا ضرور ہے لیکن اس کی Methodology مختلف ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی چیزوں سے بڑی کی جانب نہیں جاتا۔ آپ جب ایک بار یہ فن سیکھ جائیں گے پھر آپ کو کسی بابے کا ایڈریس لینے کی

ضرورت نہیں پڑے گی۔ پھر وہ چھوٹی چیز آپ کے اندر بڑا بابا بن کر سامنے آجائے گی اور آپ سے ہاتھ ملا کر آپ کی گائیڈ بن جائے گی اور آپ کو اس منزل پر یقیناً لے جائے گی جہاں آپ جانے کے آرزومند ہیں۔

سو ایک بار کبھی چھوٹی چیز سے آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ کبھی کسی نالائق پڑوسی سے خوش ہونے کی کوشش کر کے ہی یا کسی بیوقوف آدمی سے خوش ہو کر یا کبھی اخبار میں خوفناک خبر پڑھ کر دُعا مانگیں کہ یا اللہ تو ایسی خبریں کم کر دے تو آپ کا راستہ آپ کا پھاٹک کھلنا شروع ہوگا اور مجھے آپ کے چہروں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ یہ کوشش ضرور کریں گے۔ اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ بہت آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین!!



موضوع

بابوں کی نشانیاں

منظر: اشفاق صاحب کیمل کلر کا کرتا، شلوار پہنے ہوئے ہیں اُن کے دائیں بائیں خواتین بیٹھی ہیں۔

مہمان: آغا شاہد

بابوں کی نشانیاں

ہم سب کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔ایک بڑی مشکل آپ لوگوں کے ساتھ گفتگو کے شروع سے اب تک رہی ہے، اور وہ بدستور اس کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔اوراس کا مداوا مجھ سے کوئی ٹھیک طرح سے نہیں ہو پاتا،تو میں بڑی ایمانداری سے اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ ان خامیوں اور کمیوں کو کس طرح سے دور کیا جائے تا کہ اس میں آپ کی تسلی ہو،اور میری بھی تسلی ہو۔وہ یہ ہے کہ میں ''بابوں'' کا بہت ذکر کرتا ہوں،اور آئندہ بھی موقع ملا تو میں ان کا ذکر ضرور کروں گا۔

بابوں کی میں نے اپنے طور پر تعریف بھی آپ کی خدمت میں پیش کی تھی،اور اس کی Defination بھی بتائی تھی کہ ضروری نہیں کہ وہ بابا ایک بڑا لمبا سا چوغہ پہنے ہو، گلے میں ایک ہار ڈالا ہوا ہو اس نے منکوں کا،ریٹھوں کا،اور چھوہاروں کا،اور لال داڑھی



بھی ہو، اور آنکھوں میں سرخ سرمہ بھی ڈالا ہو، اور سر پر چوگوشیا ٹوپی بھی ہو، صرف وہی ہوتا ہے بابا، یہ ضروری نہیں۔ ایک بابا میں نے بتایا تھا کہ بہت ماڈرن، اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے سرخ رنگ کی چوڑی پھن دار ٹائی لگائے ہوئے۔ اس کے اندر گولڈ کا بروچ ٹانکے ہوئے۔ اعلیٰ درجے کا کیمرا ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے، اور جتنی بھی اس موجودہ دور کی ساری Equipment ہیں، وہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ وہ بھی بابا ہو سکتا ہے۔ بابا کی ایک Basic Qualificaion یہ ہے کہ وہ اس فریم ورک کے اندر رہتا ہے۔ جو اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعے انسان کے لیے طے کر دیا۔

ہم گھوڑی کے اوپر اپنا بچہ بٹھا کر مری کی پہاڑیوں کے اوپر دوڑا دیتے ہیں۔ گھوڑے کو پتا ہے کہ اس پتھر پر پاؤں رکھنا ہے، اور اس پتھر پہ پاؤں نہیں رکھنا۔ ایک کتا ہے وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کو پتا ہے کہ مجھے یوں بُو لینی ہے ایک چیز کی، اور یوں اگر کوئی غیر بندہ گھر میں آئے تو اس پر حملہ آور ہونا ہے۔ اسی طرح سے جو سارے جانور ہیں۔ وہ پختہ پیدا ہوتے ہیں اور ان کا فریم ورک ان کا چوکھٹا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک بے چارہ انسان ہی ایسا ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے تعلیم کی ضرورت ہوتی، اور وہ تعلیم حاصل کر کر کے، پوچھ پوچھ کے توجہ دے دے کے استفسار کر کر کے اپنی زندگی کا ڈھانچہ بناتا ہے اور ایک ڈگر تیار کرتا ہے جس پر کہ وہ چلتا ہے۔ پھسلتا ہے پھر چلتا ہے پھر پھسلتا ہے۔ مثلاً کتا ہو، اور گھر میں چور آ جائیں تو آپ اس کی سنگلی کھول دیں اور اس کو کہیں کہ ہش اور وہ کہے کہ جی میں نے تو ابھی F.A ہی نہیں کیا تو میں کیسے حملہ کر دوں۔ کوئی Education تو دینی چاہیے نا اس کو۔ تو کتا آرام سے بیٹھ جائے کہ جی میں B.A کروں گا تو حملہ کروں گا، ورنہ مجھے تو نہیں

آ تا، یا میں نے ٹائپ نہیں سیکھی، یا میں نے کمپیوٹر نہیں سیکھا۔ تو اللہ میاں سے پوچھا گیا کہ جی میں کیا کروں تو اللہ نے فرمایا کہ دیکھو! میں تمہارے لیے انبیاء کے ذریعے تمہارا ایک فریم ورک پہلے ہی پہنچا دیا ہے۔ جیسا وہ فرمائیں، اسی کے مطابق کرنا ہے اور مزے سے سیٹی بجاتے ہوئے زندگی کے سارے مزے لیتے ہوئے اپنی آکسیجن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، سینری سے دریاؤں سے، پہاڑوں سے، چٹانوں سے زندگی کے سفر کو طے کرنا ہے۔ تو ہم اس مقام پر آ کر پھنس جاتے ہیں، اور ہمارے درمیان وہ جو چوکھٹا یا فریم ورک دیا ہوتا ہے، اس میں، اور بھی بہت ساری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں، جو انسان کو تنگ کرتی ہیں۔ جس مخلوق کا میں نے نام لیا، اس کا طے شدہ پروگرام ہے۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق چلا رہا ہے۔ کبھی اس کے اندر اس قسم کا ٹیڑھا پن نہیں آتا، جیسا کہ انسان کے اندر آتا ہے۔

تو یہ جو بابے ہوتے ہیں نا، جنہوں نے مجھے بہت **Attract** کیا، جو ایک سیدھے راستے پر سیدھی لائن پر صراطِ مستقیم پر چلے جا رہے ہیں وہ پکار کر کہتے ہیں **اھدنا الصراط المستقیم**، اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہے، اور وہ کہتے ہیں **بسم اللہ**، ہم اس پر چلیں گے، اور وہ **انعمت علیھم** والے لوگ ہیں ان پر انعام نازل ہوتا ہے وہ بن جاتے ہیں اور میں اس کی آرزو میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا ہوں، اور بھاگتا رہوں گا کہ میں **انعمت علیھم** والے کسی بندے کو پکڑ لوں جس کے اوپر انعام نازل ہو، اور جب انعام ہو، اور جب انعام کسی بندے کو ملا ہے، اور جس راستے پر وہ جا رہا ہو گا، اس کا راستہ صراطِ مستقیم ہی ہو گا۔ ٹھیک ہے نا۔ اب میرے اندر ایک چالاکی ہے میں اس کے ذریعے ایک خود کلامی یعنی



ایکSelf Dialogue کرتا رہتا ہوں۔ مجھے کس طرح وہ راہ ہاتھ آئے، جو آسان ہو۔ ہم لوگ جو ہیں وہ کم کوش لوگ ہیں، آرام طلب لوگ ہیں، اور بھی کئی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ میں تصور کے زور پر ایکFiction Writerہونے کی حیثیت سے یہ سوچتا ہوں کہ میں مثلاً کبھی منڈی جاؤں، سبزی منڈی۔ اب میری صحت ٹھیک ہے، میں جا سکتا ہوں۔ تو وہاں پر مجھے کوئی انعام یافتہ بندہ مل جائے جس نے کچھ گاجریں، کچھ مولیاں، کچھ گوبھی خریدی ہوئی ہے، اور میں اس کو پہچانوں کہ یہ اصل بابا ہے۔ تو میں اس سے کہوں کہ سر میں آپ کا سامان اٹھالوں۔ تو وہ کہتا ہے: ''کتنے پیسے؟'' میں کہوں، جو آپ دیں گے میں لے لوں گا۔ اب وہ **انعمت علیھم** والا بندہ ہے۔ وہ کہے گا کہ اچھا۔ تو جب وہ چلے، اور میں اس کا سامان لے کر سر پر اٹھا کر چلوں تو جس رستے پر وہ جا رہا ہے، میری آرزو یہ ہے کہ میں عین اس کےFoot Stepsکے اوپر چلتا جاؤں، کیونکہ اھد نا الصراط المستقیم جو ہے نا، وہ دکھایا انہوں نے، اور وہ صراط المستقیم پر چلا جا رہا ہے۔ اللہ نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ لوگ جن پر میں نے انعام کیا، وہ میرے بندے ہیں۔ خیر، تو میں اس تلاش میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ وہ بابے جو، جو سیدھے راستے پر چلتے ہیں جو بھی کسی منڈی میں نظر آ جائیں، سڑک پر مل جائیں تو میں ان کوFollow کروں، اور جب تک میری سانس نہیں ٹوٹتی، میں ان کا پیچھا کروں، کیونکہ یہی میری زندگی کی آرزو ہے، کیونکہ میں اور جانداروں جانوروں کے مقابلے میں ایکHuman beingہوں، میںAnimal of Soulہوں۔ میرے اندر روح بھی ہے۔ بکرے، کتے اور دوسرے جانوروں کے اندر جان ہوتی ہے۔Spirit کہہ لیں ہوتی ہے،Soul نہیں ہوتی۔ میرے اندر اللہ نے

Soul بھی رکھ دی ہے،اور پھونک اپنی ماردی ہے تو میں اس کی تلاش میں رہا اور یہی بات میں نے آپ سے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ کی ہے۔تو آج میں آپ کو ایک آسانی بتانے لگا ہوں ،اور اس کی مثال جو ہے اس علاقے سے اس ٹیلیویژن سے ہے جہاں پر میں نے 1964ء سے لے کر اب تک کا وقت کسی نہ کسی صورت میں گزارا ہے۔

میرے اوپر سب سے زیادہ گرفت اس بات کی ہوتی ہے کہ جناب ہم کو بھی بتائیں کہ بابا کہاں ہوتا ہے؟ ہم کو تو کبھی ملا نہیں ۔ سچی بات ہے وہ صحیح کہتے ہیں کہ ہم کو تو ملا نہیں۔کئی دفعہ تو یہ ہوتا ہے۔کہ میں گاڑی میں جا رہا ہوں تو ریڈ بتی آ جاتی ہے آگے۔تو کوئی بندہ شیشہ نیچے کر کے کہتا ہے کہ اشفاق صاحب! وہ بابا ہم کو بھی بتائیں،اور پھر شیشے چڑھا لیتا ہے۔تو وہ اس طرح سے کہتا ہے کہ جیسے میری دکان ہو گی تو میں بتا دوں گا کہ یہ اپنا فلاں سٹور ہے وہاں سے جا کر لے لیں۔ بابا کو تو تلاش بھی اور طرح سے کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی میں ابھی آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ وہ بابا جو ہوتا ہے اچھے خوش نصیب انداز کا بابا جس کے پاس راستہ ہے یا نہیں ہے۔ اس کی نگاہیں راستے کے اوپر رہتی ہیں ۔کسی نہ کسی طریقے سے۔اور وہ لکی ہوتا ہے۔اور وہ آپ کے قریب،آپ کے اردگرد۔آپ کے لوگوں میں سے ایک ہوتا ہے۔آپ کے ساتھیوں میں سے ایک ہوتا ہے اور میری اور آپ کی اَنا اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں ایک ایسے آدمی کو بابا سمجھ لوں ،جو میرا چپڑاسی ہے۔ یہاں پھنستی ہے بات ۔ کیوں نہیں ملتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ کہتے ہیں جی کیا آج کل بھی بابا ہوتا ہے۔اکثر لوگ کہتے ہیں۔تو اس معاملے میں ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو وہ ماضی جھوٹا ہے۔اس عہد کو شہادت دینی پڑے گی کہ



پہلے کے جو لوگ گزرے ہیں، وہ ٹھیک تھے تو ایک آدمی ویسا یہاں ضرور ہے، پھر ہی کہے گا نا ۔ورنہ تو یہ کہانی ہی ہے نا۔ قصہ ہی ہے نا۔ تو وہ شاید موجود ہوتا ہے۔ اب وہ مجھے، میرے جیسے اندھے آدمی کو، جس کے دیدے ہیں اس کو کیوں نظر نہیں آتا کیونکہ میرے اوپر اَنا کی، تکبر کی، استکبار کی ایک گہری تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں برانڈرتھ روڈ میں ایک دکان کرتا ہوں۔ وہاں کا جو بابا ہے جس کے اوپر میں سامان صندوقڑی چکوا کر بھیجتا ہوں کہ جا فلانی دکان پر جا کے دے آ۔ یہ کس طرح سے بابا ہو سکتا ہے کہ میں اس کو کہوں، سلام۔ بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ کی نگاہیں میری نگاہیں، اس آدمی کو تلاش نہیں کر سکتیں، اور کبھی بھی تلاش نہیں کر سکیں گی کیونکہ آپ کے، اور اس کے درمیان ایک گہرا پردہ لٹک رہا ہے۔

جب میں **1964**ء میں ٹیلی ویژن کے ساتھ متعلق ہوا۔ یہ ٹیلی ویژن **64**ء میں آیا تھا تو میں ریڈیو میں کام کرتا تھا تو یہاں اسلم اظہر تھے۔ اس کے پہلے مدارالمہام۔ تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا کہ اشفاق صاحب آئیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہم ٹیلی ویژن کھول رہے ہیں، اور انشاء اللہ یہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔ چونکہ آپ کا ریڈیو کا کافی تجربہ ہے، اس لیے آئیں دیکھیں کہ ڈرامہ کیسے کریں گے تو میں ڈر گیا کہ یا اللہ ہماری تو کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی۔ میں تو کہیں باہر سے پڑھ کر بھی نہیں آیا۔ ہمیں پتا ہی نہیں کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ تو اگلے دن میں کرسی پر بیٹھا تھا، اور اسلم صاحب اندر کچھ کام کر رہے تھے، اور مجھے ان سے ملنا تھا لیکن خوف دل میں بدستور قائم تھا، ڈرامے کے بارے میں یہ ڈرامہ کیسے لکھا جائے گا۔ یہ کیسے ہوگا، ہماری تو کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی۔ تو جہاں میں کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے قریب ہی

ایک اور بنچ تھا، اُس کے اوپر نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو بھی ملنا ہے تو اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو میں نے کہا کہ اچھا بڑی خوشی کی بات ہے۔ پھر میں اندر چلا گیا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ ڈسکس کرتے رہے اور میرا خیال تھا کہ وہ نوجوان بھی اندر چلا گیا ہوگا۔ اس نے بھی کچھ باتیں کی ہوں گی، اور وہ جس نوکری کے لیے آیا تھا، اسے اس نوکری پر رکھ لیا گیا۔ وہ صاحب کا ڈرائیور تھا۔ اس شخص کا نام میں آپ کو آج بتاتا ہوں، وہ گُل حیدر تھا۔ وہ اس سٹیشن میں اس چاردیواری کے اندر صاحب کی بڑی گاڑی چلانے پر مامور ہو گیا لیکن جب میں اس کے پاس بیٹھا تھا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس کے انداز، اس کے چہرے سے اس کے ساتھ ایک دو باتیں کرنے کے انداز سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا تھا کہ یہ آدمی کچھ مختلف سا ہے۔ بہر کیف اس کی نوکری لگ گئی۔ چلتا رہا یہ سب۔ پھر ہم یہاں آتے رہے۔ اور وہ ملتا رہا۔ سلام کرتا رہا بڑے اَدب کے ساتھ، اور ہماری اور اس کی گفتگو ہوتی رہی، لیکن میرے سارے ساتھی جو 2000 بندے یہاں کام کرتے تھے، ان کے مقابلے میں میری نگاہ مختلف تھی کہ یہ ڈرائیور جو ہے گُل حیدر، یہ کچھ اور طرح کا ہے۔ لوگ اپنی تنخواہیں بڑھانے کے لیے نعرے مارتے تھے، جیسے چھوٹے ملازمین وغیرہ کرتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک کونے میں پرے کھڑا ہوتا تھا۔ تو میں کہتا تھا کہ گُل حیدر تم بھی نعرے لگاؤ۔ وہ کہتا تھا: ''نہیں صاحب! وہ سب کھڑے ہیں نا، وہ Community اپنی'' لیکن اس کے اندر ایک احتجاجی رنگ نہیں اختیار کر سکا۔ پتا نہیں کونسی بات تھی یا کونسی بات نہ تھی کہ میں یوں کر کے کہہ دوں کہ یہی بات تھی، لیکن میں اس سے متاثر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میں اسے دیکھ دیکھ کر اس کے متعلق بات نہ کر کر کے کچھ اس سے اتنا خوفزدہ سا ہو گیا تھا کہ میرے اندر



ادب کی وہ لہر جو ایک اچھے آدمی کے لیے دل میں پیدا ہوتی ہے، وہ زیادہ دبیز ہو گئی، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے زیادہ Face کروں یا وہ میرے سامنے آئے۔ ایسے بھی ہوا ہے کہ میں یہاں سے کوئی ایک دو پروگرام کر کے نکلا ہوں تو اسلم صاحب نے کہا کہ چلیں گل حیدر آپ کو چھوڑ دے گا۔ ڈرائیور تھا نا۔ تو میں نے کہا کہ جی میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اور مجھے اسلم صاحب کہتے کہ کیوں جی کیا ہو گیا۔ یہ تو بڑا اچھا ہے۔ یہ ہمارے سارے لوگوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ بڑا Safe ہے اور بہت دھیمے مزاج کا آدمی ہے، تو میں کہتا کہ نہیں سر مجھے کسی اور کے ساتھ بھیج دیں، کیونکہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ خیر اُن کو سمجھ نہ آئی میری بات۔ آج میں ایک بڑا عجیب سا راز آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں، جو شاید اگر آج یہ بات چیت نہ ہو رہی ہوتی تو میں کبھی بیان نہ کرتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے میری اَنا، اور میرا تکبر اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ میں اس کے زیادہ قریب نہ ہوں جتنا کہ آدمی آ جایا کرتا ہے۔

میں ایک بڑا پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بڑا Well placed ہوں، اور میرا رتبہ بہت ہے، اور لوگ مجھے بہت زیادہ سلام کرتے ہیں۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ جتنی دیر وہ یہاں رہا، اور جتنی دیر میں وہاں رہا، اس کے سامنے اپنے آپ کو ایک معمولی انسان ہی سمجھتا رہا، اور مجھے یقین ہے، اور میرا ایمان ہے کہ میں ٹھیک تھا، اور میں سچائی پر تھا اور میں حق پر تھا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ ہم یہاں پر کسی ڈرامے کی شوٹنگ کرنے کے لیے باہر گئے۔ کسی پانی کنارے، کسی دریا پر، راوی کے اوپر، تو وہاں پر گل حیدر کا جو بیٹا تھا، اس کو بھی

انہوں نے Cable Boy یعنی جوتار اٹھاتے ہیں مقرر کر دیا تھا۔ تو Out Door شوٹنگ تھی ۔گل حیدر کا بیٹا بڑا اچھا، بڑا پیارا سا خوبصورت سا جیسے پٹھانوں کے بچے ہوتے ہیں۔ وہ تھا ۔ بچہ کچھ شرارتی سا تھا۔ اس نے جیسے بچے Rowdyism کرتے ہیں، پانی میں چھلانگ لگا دی ۔اب وہ ایسی خوفناک جگہ تھی کہ جہاں پر اس بچے کے ڈوبنے کا لوگوں کو 100 فیصد خدشہ ہو گیا تھا، اور کسی کی بھی ہمت نہ پڑی کہ اسے نکالا جائے ۔ جو تیرنا جانتے تھے ،ان کی بھی نہیں تو اس Cable Boy نے کیبل چھوڑ کر اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی ،اور جا کر اس کو پکڑ لیا۔ ڈوبنے سے اُس کو بچا لیا۔لیکن خود ڈوب گیا ،اور سب لوگ جو شوٹنگ کے لیے وہاں موجود تھے ،اُن کے دلوں پر اس کا بڑا بوجھ تھا۔ اور ہم اس کے جسدِ خاکی کو لے کر گئے ۔ایک جیتا جاگتا اچھا بھلا آدمی لے کر گئے تھے لاش لے کر آ گئے ۔واپس لے کر آئے ۔ اب میرے لیے اس کو Face کرنا مشکل ہو گیا وہ ایک باپ تھا اور اس نے بڑی اُمنگوں ،آرزوؤں کے ساتھ اس کو پالا تھا، میرا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔لیکن میں چاہتا تھا کہ میں ضرور جاؤں ۔تو آخر میں اس کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ گل حیدر یہ حادثہ ہو گیا ہے۔ اور مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔ کہنے لگا نہیں سر افسوس تو تب ہوتا جب یہ حادثہ ہوتا۔ یہ تو بس اللہ کا حکم ہی ایسا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ صاحب اللہ کی کتاب ہوتی ہے نا۔ بس اس میں ایسے لکھا تھا۔ اب میں Faith کی بات کرتا ہوں ۔ اس نے کہا کہ صاحب اس کا حکم تھا ،اب ہم اس کے حکم کے آگے سر نہیں اٹھا سکتے ۔ میں نے کہا ،افسوس ہے۔ کہنے لگا ،ہاں جی افسوس ہے۔ میں نے کہا کہ غم ہے، کہنے لگا ،کوئی غم نہیں ۔بس جی جب میں گھر جاتا ہوں تو میں بیٹھتا ہوں ، مجھے اس کا

چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں غم میں ڈوب سکتا ہوں، کرب میں مبتلا ہو سکتا ہوں، اپنے آپ کو پامال کر سکتا ہوں لیکن میں شکایت نہیں کروں گا۔

میں نے بہت سا وقت اس کے قریب مختلف زاویوں سے گزارا کہ دیکھیے! ایک بڑے آدمی کو Face کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اور جب آپ کا اندر ماننے لگے، تو پھر تو اور بھی مشکل ہے۔ دیکھیے نا پولیس آفیسر آتے ہیں۔ اُن سے لوگ ڈرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب آپ کا اپنا اندر ماننے لگے تو بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر کیف اب ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لمبا وقت گزر گیا۔ ٹائم کتنا سارا چلا گیا اور گُل حیدر اس ٹیلی ویژن کے دفتر سے اس سٹیشن سے ریٹائر ہو گیا اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔ میری بڑی آرزو تھی کہ میں اب ریٹائر ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں کچھ موقع نہیں ملا۔ کچھ ٹائم نہیں ملا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دن وہ مجھے مل گیا، اور وہ بہت خوش تھا۔ میں نے کسی ریٹائر آدمی کو اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے کہا کہ ریٹائر ہو گئے ہو۔ کہنے لگا جی صاحب جی۔ میں نے کہا، آپ خوش ہیں۔ کہنے لگا کہ جی اللہ کا بڑا فضل ہے۔ میں نے کہا کہ اب تم کیا کرو گے۔ کہنے لگا، کہ سب سے پہلا کام میں یہ کروں گا کہ میں اپنا ڈرائیونگ لائسنس پھاڑ کر پھینک دوں گا کہ دوبارہ آرزو پیدا نہ ہو نوکری کرنے کی، ڈرائیوری کرنے کی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں خضاب نہیں لگاؤں گا۔ وہ لگاتا تھا روزانہ اپنے آپ کو سیٹ رکھنے کے لیے اور تیسری بات یہ اس نے کہی کہ اشفاق صاحب میری بڑی آرزو ہے کہ اب میں ذبا کر عبادت کروں۔ میں اکیلا بیٹھوں گا، اور اپنے اللہ سے کچھ باتیں کروں گا۔ یہ میری بڑی آرزو ہے۔ بڑا جی چاہتا ہے۔ بس وہ یہ تین خواہشیں تھیں اُس کی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے میرا دل سے اس کو سلام پہنچتا رہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری اَنا، آپ کا تکبر، آپ کی سوچ ہمارا اپنے آپ کے اندر پھنسے رہنا۔ ہمارے قریب سے یقیناً اس قسم کے بڑے آدمی گزرتے رہتے ہیں، اور ہم پوچھتے رہتے ہیں کہ جناب ہم کو تو کوئی نہیں ملا۔ ہم نے اتنی بڑی اَنا کی لٹھ مونڈھے پر رکھی ہوئی ہے کہ کوئی قریب تو آئے ہم اس کا بوتھا سینک دیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ



موضوع

نیک خواہشات

منظر: اشفاق صاحب سفید شال، کالا کرتا اور شلوار پہنے صوفے سے ٹیک لگائے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ پس منظر میں سرو کا پودا نمایاں ہے۔

مہمان: غیور اختر (ڈراما آرٹسٹ)

نیک خواہشات

میں اکثر عرض کرتا ہوں کہ جب وقت ملے اور گھر میں کوئی دیوار ہو تو اس کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ کر اپنا تجزیہ ضرور کیا جانا چاہیے۔ یہ ہے تو ذرا سا مشکل کام اور اس پر انسان اس قدر شدت کے ساتھ عمل پیرا نہیں ہو سکتا، جو درکار ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی اپنی باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ یہ جو رفوگر ہیں کشمیر میں برف باری کے دنوں میں اپنا سوئی دھاگہ لے کر چلے جاتے ہیں اور وہاں کپڑے کے اندر ہو جانے والے بڑے بڑے شگافوں کی رفوگری کا کام کرتے ہیں جن میں خاص طور پر گرم کپڑوں کے شگاف اور لگار اور چناخ جو ہوتے

ہیں اُن کی رفو گری کرتے ہیں کہ ہم ٹریس نہیں کر سکتے کہ یہاں پر اتنا بڑا Gape سوراخ ہو گیا تھا، کیونکہ وہ بالکل ایسا کر دیتے ہیں جیسے کپڑا کارخانے سے بن کر آتا ہے۔

یہ رفو گروں کا کمال ہے۔ وہ غریب لوگ اپنی چادر لے کر اور اپنی کانگڑی مٹی کی بھٹی سلگا کر اس میں کوئلے ڈال کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوتے ہیں اور بہت بھلے لوگ ہیں یہ کشمیری لوگ۔ بڑی ہی بھلی کمیونٹی ہیں کیونکہ وہ اپنا تجزیہ کرتے ہیں اور اُن کو پتہ چلتا رہتا ہے اپنے اس Self کا جو لے کر انسان پیدا ہوا تھا محفوظ رکھا ہوا ہے یا نہیں۔ گو ہم نے تو اپنی Self کے اوپر بہت بڑے بڑے سائن بورڈ لگا لئے ہیں، اپنے نام تبدیل کر لئے ہیں، اپنی ذات کے اوپر ہم نے پینٹ کر لیا ہے۔ ہم جب کسی سے ملتے ہیں مثلاً میں آپ سے اس اشفاق کی طرح نہیں ملتا، جو میں پیدا ہوا تھا۔ میں تو ایک رائٹر ایک دانشور ایک سیاستدان، ایک مکار، ایک ٹیچر بن کر ملتا ہوں۔ اس طرح جب آپ مجھ سے ملتے ہیں تو آپ اپنے اپنے سائن بورڈ مجھے دکھاتے ہیں۔ اصل Self کہاں ہے وہ نہیں ملتی۔ اصل Self جو اللہ نے دے کر پیدا کیا ہے وہ تب ہی ملتا ہے جب آدمی اپنے نفس کو پہچانتا ہے لیکن اس وقت جب وہ اکیلا بیٹھ کر غور کرتا ہے کوئی اس کو بتا نہیں سکتا۔ اپنے نفس سے تعارف اس وقت ممکن ہے جب آپ اس کے تعارف کی پوزیشن میں ہوں اور اکیلے ہوں۔ جس طرح خداوند تعالیٰ

فرماتا ہے: ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔'' جس انسان نے خود کو پہچان لیا کہ میں کون ہوں؟ وہ کامیاب ہو گیا اور وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو باوجود اس کے کہ علم زیادہ نہیں رکھتے، اُن کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں لیکن علم اُن پر وارد ہوتا رہتا ہے۔ جو ایک خاموش آدمی کو اپنی ذات کے ساتھ دیر تک بیٹھنے میں عطا ہوتا ہے۔

میں پہلے تو نہیں اب کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں اور عمر کے اس حصے میں میری طبیعت پر ایک عجیب طرح کا بوجھ ہے، جو کسی طرح سے جاتا نہیں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرتا ہوں۔ اب میں چاہوں گا کہ میں اپنی مشکل آپ کے سامنے بیان کروں اور آپ بھی میری مدد کریں کیونکہ یہ آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ آپ مجھ جیسے پریشان اور دردمند آدمی کا سہارا بن جائیں۔ ہمارے بابے جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی محفل میں کسی یونیورسٹی، سیمینار، اسمبلی میں، کسی اجتماع میں یا کسی بھی انسانی گروہ میں بیٹھے کوئی موضوع شدت سے ڈسکس کر رہے ہوں اور اس پر اپنے جواز اور دلائل پیش کر رہے ہوں اور اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی دلیل آجائے جو بہت طاقتور ہو اور اس سے اندیشہ ہو کہ اگر میں یہ دلیل دوں گا تو یہ بندہ شرمندہ ہو جائے گا کیونکہ اس آدمی کے پاس اس دلیل کی کاٹ نہیں ہوگی۔ شطرنج کی ایسی چال میرے پاس آگئی ہے کہ یہ اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اس موقع پر

''بابے'' کہتے ہیں کہ ''اپنی دلیل روک لو، بندہ بچا لو اسے ذبح نہ ہونے دو کیونکہ وہ زیادہ قیمتی ہے۔'' ہم نے تو ساری زندگی کبھی ایسا کیا ہی نہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ''میں کھڑکار پادیاں گا۔'' ہماری بیبیاں جس طرح کہتی ہیں کہ ''میں تے آپاں جی فیر سدھی ہو گئی اوہنوں ایسا جواب دتا کہ اوہ تھر تھر کنبن لگ پئی۔ میں اوہنوں اِک اِک سنائی۔ اُوہدی ماسی دیاں کرتوتاں، اُودھی پھوپھی دیاں وغیرہ وغیرہ۔''

خیر انسان کمزور ہے ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ بڑی دیر کی بات ہے، **1946**ء کی جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ میں اس وقت بی اے کر چکا تھا اور تازہ تازہ ہی کیا تھا۔ ہمارے قصبے کے ساتھ ایک گاؤں تھا اس میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول تھا وہاں کا ہیڈ ماسٹر چھٹی پر گیا۔ اس کی جگہ تین ماہ کے لیے مجھے ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ اب میں ایک پدا سا چھوٹے قد کا نوجوان بڑے فخر کے ساتھ ایک سکول کو ہینڈل کر رہا ہوں۔ گو مجھے زیادہ تجربہ نہیں ہے لیکن میں زور لگا کے یہ بتانا چاہتا ہوں دوسرے ماسٹروں کو کہ بی اے کیا ہوتا ہے کیونکہ وہ بیچارے نارمل سکول پڑھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہر نئے آدمی کی عادت ہوتی ہے یا جو بھی کسی جگہ نیا آتا ہے وہ ہمیشہ ٹھیک کرنے پر لگ جاتا ہے۔ یہ بندے کے اندر ایک عجیب بَلا ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ میں سکول کا سسٹم ٹھیک کروں گا حالانکہ مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ میں پڑھاتا اور بہتر طور پر پڑھاتا اور جیسا نظام چل رہا تھا، اُسے چلنے دیتا۔ لیکن میں نے کہا نہیں اس کا سسٹم بدلنا

چاہیے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ یہ گملا اِدھر نہیں اُدھر ہونا چاہیے۔ وہ جو سن فلاور سورج مکھی ہوتا ہے وہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اس پیلے پھول کو میں نے وہاں سے نکال دینے کا حکم دیا۔ اَب اگلا پھٹا پیچھے کر کے پچھلا آگے کر کے سسٹم تبدیل ہو رہا ہے۔

''گملوں کو گیرو لگا دو سرخ رنگ کا''

''سفیدی کر دو''

''تمام ماسٹر صاحبان پگڑی باندھ کر آئیں''

اس طرح سکول میں سسٹم کی تبدیلی جاری تھی۔ ماسٹر بیچارے بھی عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ سکول میں چھٹی کے وقت پہاڑے کہلوائے جاتے تھے۔ چھ کا پہاڑہ ماسٹر صاحب کہلوا رہے تھے:

چھ اکم چھ

چھ دونی بارہ

چھ تیا اٹھارہ

چھ چوکے چوبی

میں نے سکول میں ایک شرط عائد کر دی کہ بچوں میں شرمندگی اور خفت دور کرنے کے لیے اُن کو سٹیج پر آنا چاہیے اور بلیک بورڈ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ پہاڑہ لکھنا چاہیے۔ چوتھی جماعت کا ایک لڑکا تھا اب مجھے اس کا نام یاد نہیں صادق تھا یا

صدیق۔ اس نے تختہ سیاہ پر لکھنے سے انکار کر دیا کہ میں نہیں لکھوں گا۔ استاد نے کہا کہ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا حکم ہے تمہیں وہاں جا کر لکھنا پڑے گا، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ شرماتا ہوگا بیچارہ گاؤں کا لڑکا۔ اسے میرے سامنے پیش کیا گیا۔ بتایا گیا کہ یہ لڑکا پہاڑہ تو ٹھیک جانتا ہے۔ لیکن بورڈ پر لکھتا نہیں۔ میں نے پوچھا: ''تم کیوں نہیں لکھتے'' اُس نے کہا: ''میں نہیں لکھوں گا'' میں نے اس کا کان پکڑ کر مروڑا اور کہا: ''کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے سخت سزا دوں گا کیونکہ تم میرے اصول کے مطابق کام نہیں کر رہے'' اس نے کہا کہ جی میں یہ نہیں کر سکتا مجھ سے لکھا نہیں جاتا شرمیلا تھا شاید۔ میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اسے ساری کلاسوں میں پھرائیں اور سب کو بتائیں کہ یہ نافرمان بچہ ہے اور اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات نہیں مانی۔ ماسٹر صاحب اسے میرے حکم کے مطابق لے گئے اور اُسے گھماتے رہے۔ دیگر استادوں نے بھی بادل نخواستہ اپنی طبیعت پر بوجھ سمجھ کر میرے اس حکم کو قبول کیا تاہم انہوں نے میری یہ بات پسند نہیں کی۔ جسے میں اپنی انتظامی صلاحیت خیال کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکا چلا گیا۔ اس کے بعد کبھی سکول نہیں آیا۔ اس کے والدین نے بھی کہا کہ جی وہ سکول نہیں جاتا۔ گھر پر ہی رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک فیصلے اور حکم سے اسے اتنا بڑا زخم دے دیا تھا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکا۔ گو میں نے بدنیتی سے ایسا نہیں کیا تھا لیکن اب میں بیٹھ کر سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ میں نے اتنے اچھے صحت مند

پیارے بچے کے ساتھ کیا حماقت کی اس وقت میرے ذہن میں Scare یعنی زخم کا لفظ نہیں آیا۔ تب میں سمجھتا تھا کہ پڑھانے کے لیے ایسا ہی سخت رویہ ہونا چاہیے۔

وہ زمانہ گزر گیا، پاکستان بن گیا۔ ہم ادھر آ گئے۔ وہ لوگ پتا نہیں کدھر ہوں گے۔ ایسے ہی مجھے پتا چلا کہ وہ گھرانہ ساہیوال چلا گیا تھا۔ باپ کو اسے پڑھانے کا بڑا شوق تھا، خواہش تھی۔ اس نے بچے کو پھر سکول داخل کرایا لیکن وہ سکول سے بھاگ جاتا تھا۔ ڈرتا تھا اور کانپتا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ بہت سال بعد مجھے پھر معلوم ہوا کہ اس لڑکے نے بُری بھلی تعلیم حاصل کر لی ہے اور لاہور سے انجینئرنگ یونیورسٹی سے بی ایس سی بھی کر لی ہے۔ ایک اندازہ تھا لوگ مجھے آ کر یہ بتاتے تھے کہ شاید وہی لڑکا ہے کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ پچھلی سے پچھلی عید پر جب ہم نماز پڑھ چکے تب ہم عید کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ معانقہ کرتے ہیں جپھی ڈالتے ہیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اس بندے کو جانتے ہیں یا نہیں۔ آپ کی صف میں جو بھی ہو اس سے معانقہ کیا جاتا ہے۔ کوئی واقف کار ہو یا نہ ہو۔ میرے ساتھ لوگ ملتے رہے اور ہم بڑی محبت سے ایک دوسرے سے جپھی ڈالتے رہے۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا تھا، وہ بھی کسی سے مل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ میری طرف تو متوجہ نہیں ہوتا میں ہی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور جب میں نے آگے بڑھ کر اسے جپھی ڈالنے کی کوشش کی تو اس نے دونوں ہاتھوں

سے مجھے پرے دھکیل دیا۔ اب میرا یقین ہے کہ یہ وہی لڑکا تھا۔ میں تو اس وقت بڑا تھا۔ وہ چھوٹا تھا تب اور وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اب میں اس کو تلاش کرتا ہوں اور بہت تکلیف میں ہوں اور اس بات کا آرزومند ہوں کہ کسی طرح سے مجھے اس سے معافی مل جائے۔

بظاہر تو یہ اتنی بڑی کوتاہی نہیں تھی لیکن جو واقعہ گزرا اور جس طرح سے اس کے دل کے اوپر لگا اور وہ زخم کتنے ہی سال گزرنے کے بعد بھی اس کے دل پر چلا آ رہا ہے اور اب وہ واقعہ ایک نئے رُوپ میں مجھے پریشان کرتا ہے، دُکھ دیتا ہے۔ میں آپ سب سے درخواست کروں گا کہ بظاہر یہ بات معمولی لگتی ہے بظاہر ہم یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ میں نے اس کو ایسا پوائنٹ مارا کہ اس کی پھنکری پھُل کر دی لیکن ایک بندہ زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے اندر کی لاش ساتھ اُٹھائے پھرتا ہے اور آپ اس کے قاتل ہیں۔ اِس کا دین، اس کی دیت، اِس کا قصاص کس طرح ادا کیا جائے، یہ سمجھ سے باہر ہے۔ وہ کشمیری جن کو بھارتی گورنمنٹ اپنا اٹوٹ انگ کہتی ہے کہ یہ ہمارے بدن کا ایک حصہ ہیں مگر ان بھارتیوں نے گزشتہ 56 برسوں میں کتنے زخم کشمیریوں کو دیے ہیں۔ جسمانی بھی، روحانی بھی، نفسیاتی بھی اور ہر طرح کے زخم اور وہ ساری کی ساری قوم بھارت کے سامنے ایسی ہی ہوگئی ہے جیسے وہ زخم لیے پھرتی ہو۔ کچلی ہوئی انا کا زخم، زبان کا زخم، اسلحے بارود کا زخم اور ان کی یہ کیفیت اجتماعی طور پر

ہے۔

لوگ اکثر بیٹھے یہ باتیں کرتے ہیں کہ بھارتی فلموں کے بہت اچھے ناچ گانے ہوتے ہیں۔ وہ دھیمے انداز کی بیبیاں، ماتھے پر بندی لگاتی ہیں، تو اچھی لگتی ہیں۔ لیکن جس طرح کشمیریوں کا دُکھ محسوس کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں میں اتنی بڑی قوم کو ملاحظہ کرتا ہوں تو سارے کشمیر میں کوئی گھر ایسا نہیں جس میں بھارت کی فوج نے کوئی جانی نقصان نہ کیا ہو اور پھر ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے بہت پیارے ہیں اور ہمارے بدن کا حصہ ہیں اور ہمارا اٹوٹ انگ ہیں۔ شاید ان کی کشمیریوں کے لیے محبت کا یہی انداز اور طریقہ ہے کہ وہ چھ سات لاکھ کی فوج کشمیر کے اندر بھیج کر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ایسی کوتاہیاں انفرادی طور پر بھی آدمی سے ہوتی ہیں اجتماعی طور پر بھی ہوتی ہیں۔ لیکن جب مسلسل اجتماعی رنگ میں ہونے لگیں تو اس کے باوجود بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہیں لیکن یہ کامیابی نہیں ہوتی۔ ہمارے اور اللہ کے ٹائم میں بڑا فرق ہے۔ ہمارا جو ایک دن ہے وہ اللہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔ پتا نہیں ہمارا کتنا ٹائم لگ جائے تو پھر اللہ کا ایک دن بنے۔ اللہ نے کہیں فرمایا بھی ہے کہ وقت کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ہمارے وقت سے مختلف۔ اب ہم اپنے ان کشمیری بھائیوں کا اور میں اپنے اس بچے کا جس کا میں ہیڈ ماسٹر بن گیا تھا اس طرح سے پراسچت کر سکتے ہیں، ایسی تلافی کر سکتے ہیں کہ ہم ان کی بہتری چاہیں دل سے

انہیں اچھاWish کریں۔ یہ ایسی بات ہے جو دعا سے بھی طاقتور ہوتی ہے۔ ہم اُن کے ساتھ جا کر لڑ تو نہیں سکتے۔ میں اس کے اوپر یعنی Well Wishing پر کسی اگلے پروگرام میں بات کروں گا۔ دُعا لفظوں کے ساتھ مانگی جاتی ہے لیکن جب آپ کسی کے لیے Well Wish نیک خواہشات کے اظہار کے طور پر کریں، آرزو اچھی رکھیں اور آپ کسی کو کہہ دیں کہ غلام محمد بڑا اچھا آدمی ہے، اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ چاہے آپ کسی کو بے خیالی میں کہہ دیں پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ کی وہ دُعا قبول نہ ہو۔

ہمارے قدرت اللہ شہاب صاحب کا بھی سٹائل تھا۔ جو بھی اُن سے دُعا کرنے کی درخواست کرتا آپ اُسے Well Wish کرتے۔ اکثر اس کا کام بن جاتا۔ آپ سب ان لوگوں کے لیے جو بڑے دُکھ سے گزر رہے ہیں اور بڑی تکلیف میں ہیں اُن کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے تو Well Wish ضرور کریں اور اگر آپ کے گھر کے اندر کوئی دیوار ہے اور کبھی آپ کو مغرب کا وقت میسر آئے تو آپ اس کے ساتھ ڈھو، ٹیک لگا کر بیٹھیں اور اپنے اللہ سے یہ ضرور کہیں کہ ''میں اپنے ان بھائیوں اور بہنوں کے لیے جن پر صریحاً ظلم ہو رہا ہے محض اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں خدا ان پر رحم کرے اور کہیں کہ اے اللہ! میں ان کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا صرف Well Wish کر سکتا ہوں۔ اے اللہ! تو مدد فرما۔'' لیکن آپ کو اس کے لیے

وقت نکالنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ آپ چلتے ہوئے رسماً پڑھ لیں اس طرح سے **Well Wish** اثر نہیں کرے گی۔ جو ہاتھوں کی زنجیر بنتی ہے، وہ تصویر کھینچنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ تصویر جو الگ بیٹھ کر آپ کھینچیں گے یہ اللہ کے دربار میں کھنچے گی اور اللہ اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ میرے لیے بھی یہ دُعا ضرور کیجیے گا کہ وہ نوجوان اَب ماشاء اللہ اس کے بچے ہوں گے، مل جائے اور اتنا ناراض نہ رہے، جتنا ناراض ہونے کا اسے حق پہنچتا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ کو آسانیوں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!



موضوع

بات ہے سمجھ کی

منظر: اشفاق صاحب کیمل کلر کا کرتا، شلوار اور اوپر چادر اُوڑھے جنگل میں بیٹھے ہیں۔ اُن کے سامنے مٹی کی کنالی اور مٹی کے گلاس پڑے ہیں۔

مہمان: NCA کے طالب علم۔

بات ہے سمجھ کی!

اتنی ساری بیٹیوں کی موجودگی میں آدمی کا دل بہت خوش ہوتا ہے اور اُس کو ہمیشہ بڑی تقویت ملتی ہیں اصل میں بات یہ ہے کہ بیٹا مطلوب ہوتا ہے، اور بیٹی لاڈلی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ وہ نہیں لے سکتی اور اس کی وجہ وہ نہیں لے سکتا، لیکن اگر حساب لگا کر دیکھو اعداد و شمار کے مطابق تو بیٹی کا نمبر ہمیشہ اوپر ہی رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ طے شدہ بات ہے کہ عورت کا احترام بہت ہے۔ جب آپ باہر نکل کر دیکھیں تو ہر ایک شے کے اوپر آپ کو "ماں کی دُعا" لکھا ہوا ملے گا، بیوی کی دُعا کہیں بھی نہیں۔ ایک بھی رکشہ پر نہیں لکھا ہوتا۔ عورت ماں کے روپ میں ہو، بیٹی کے روپ میں، بہن کے روپ میں ہو، عورت کی بڑی عزت دلوں میں ہوتی ہے۔ جھگڑے وگڑے ہو جاتے ہیں، لیکن بابا کو اپنی بیٹی اور بیٹیاں ہمیشہ بہت پیاری اور بہت لاڈلی ہوتی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ یورپ کے کچھ ملک یہ سمجھتے



ہیں کہ ہمارے یہاں پر عورت کی عزت نہیں اور اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا ہے، اور کچھ ادارے انہوں نے اس طرح کے بنا دیئے ہیں کہ چیک کرنے کے لیے کہ کیا واقعی بُرا برتاؤ ہوتا ہے۔

کافی دیر کی بات ہے کہ میرے دفتر میں آیا ایسے ہی ادارے کا ایک آدمی، وہ بڑا بھلا سا نیک سا نوجوان تھا، اور جرمنی کے لوگ تحقیق کے معاملے میں اتنے ضدی، اتنے کڑوے، اور اتنے کسیلے نہیں ہوتے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ کر اس کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن وہ بے چارہ آیا تھا، بہت سارے تصورات لے کر اپنے ذہن میں کہ میں پاکستان جا رہا ہوں اور اس کے بارے میں یہ کہانیاں موجود ہیں۔ تو اس نے میرے دفتر میں مجھ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ سر **You don`t mind if I ask you direct question** کہ آپ اپنی بیوی کی صبح کے وقت مارتے ہیں یا شام کو مارتے ہیں؟ تو میں نے کہا، شام کے وقت۔ میں دفتر سے تھکا ہارا جاتا ہوں تو ٹھیک طرح سے نہیں مار سکتا اس لیے میں صبح جب میں فریش ہوتا ہوں تو بانو قدسیہ کو ''کھڑکا'' جاتا ہوں۔

بے چارے کو بڑی کوفت ہوئی۔ کہنے لگا: ''آپ تو بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں'' میں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں۔ ویسے ہماری جو محبت آپس کی ہے، وہ چلی آ رہی ہے۔ چاہے آپ کتنا بھی ہمارے خلاف پروپیگنڈا کریں، اس کا اثر مجھ پر یا میری بچیوں پر یا میرے بچوں پر نہیں ہوگا۔

ایسے ہی بارہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ یہ بچے بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں، اور بڑے اَڑیل ہوتے ہیں۔ میں چونکہ اس عمر میں ہوں، اور میں نے بہت سے زمین پر پاؤں بجتے ہوئے سنے ہیں، اور میں نے اس کے آگے سر جھکایا ہے، تو میرے دفتر میں پانچ چار نوجوان طالب علم آ گئے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں، دو لڑکے تھے، اور وہ پولیٹیکل



سائنس کے 6th Year میں تھے۔اسے آپ کیا کہتے ہیں Second Part کے سٹوڈنٹ تھے۔ان میں ایک لڑکی تھی، اس کا نام کلثوم تھا۔ایک کا یاسمین، ایک کا مجھے یاد نہیں، اسے ببلی، ببلی کہہ کر پکارتے تھے۔وہ کچھ زیادہ بولی نہیں، اور دو لڑکے تھے، نوجوان بڑے اچھے سے پیارے خوش شکل۔

کلثوم ان کی لیڈر تھی، اور اس کے چہرے کے اوپر کچھ نشان تھے۔لڑائی جھگڑے کے دھبے۔جب یہ لوگ میرے دفتر آئے تو کلثوم آتے ہی دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی: ''انکل ہم نے دیکھا ہے، آپ کا معاشرہ، اور ہم نے دیکھا ہے آپ کا مذہب، اور سب لوگ جو ہیں بڑے چالاک اور بے ایمان، اور سخت ہوتے ہیں ہم لڑائی کر کے آئے ہیں۔''میں نے کہا: ''کیا ہو گیا'' اس نے کہا: ''میرا نام یہ ہے، اور یہ میرے ساتھ میری کلاس فیلو، ان کا نام یہ ہے، اور ان کا نام یہ ہے۔تو تعارف کرانے کے بعد اس نے کہا، آپ بڑے مامے بنتے ہیں اخلاقیات کے اور دین کے'' میں نے کہا: ''ہو کیا گیا؟'' کہنے لگی، ہم سپاہیوں سے لڑ کر آئے ہیں۔انہوں نے جلوس وغیرہ نکالا ہوگا۔آگے سپاہنیں ہوتی ہیں۔بے چاری اچھی ہوتی ہیں۔ان کو حکم جو ہوتا ہے، ان کو روکو تو ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہمارے لاہور میں ایک جگہ ہے جہاں یہ T.V وغیرہ بہت بکتے ہیں، ہال روڈ۔اس کے اوپر جھگڑا تھا۔میں نے کہا: ''جھگڑا کس بات پر ہو گیا؟'' تو اس نے کہا: ''جی یہ کیا قانون بنایا ہے آپ نے، لوگوں سے خوانخواہ کہا کہ ہمارے حقوق آدھے ہیں، مردوں کے پورے۔کہنے لگی یہ کیا بات ہوئی کہ عورت قتل ہو جائے تو آدھی دیت اور مرد قتل ہو جائے تو زیادہ'' میں نے کہا: ''تم نے اس پر جلوس کیوں نکالا، یہ تو مجھے جلوس نکالنا چاہیے تھا۔میں نکالوں گا کل سے جلوس، یہ تو کمال کی بات ہے۔'' وہ غصے میں تھی، کہنے لگی: ''آپ کیوں جلوس نکالیں گے؟'' میں نے کہا، میں اس لیے جلوس نکالوں گا کہ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ میں



مر جاؤں گا۔ تو بانو قدسیہ کو ایک لاکھ روپیہ مل جائے، وہ مرے تو مجھے پچاس ہزار ملیں۔ یہ تو الٹا ہو گیا کام" کہنے لگی: "ہاں ہم تو پھر جلوس نکال کے آئے ہیں" میں نے تو یہ الٹا جلوس نکال دیا تمہارا۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ اگر میری بیوی خدانخواستہ قتل ہو جائے تو مجھے چار پانچ لاکھ ملیں، میں مارا جاؤں تو میری بیوی کو 25-26 روپے مل جائیں، تاکہ اس کو کوئی سزا ملے۔ اس کی ساتھی کہنے لگی: "دیکھو یاسمین میں نے تم سے کہا تھا نا کہ انکل کے پاس نہیں جانا۔ یہ ہمیشہ ایسی اُلٹ بات کرتے ہیں۔" میں تو اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ تو کہنے لگی: "یہ ہم نے دیکھا ہوا ہے۔ آپ کا یہ سب فلسفہ، میں آپ کی پروا نہیں کرتی۔ میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں ہم سارے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پرانے دقیانوسی دھات، پتھر کے زمانے کی چیزیں، اس زمانے کی آپ نے اخلاقیات میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سب میں نے کنڈم کر دی ہیں۔" میں نے کہا: "کوئی بات نہیں۔ کنڈم کرتی ہیں تو کریں، تمہیں پورا حق پہنچتا ہے۔" وہ کہنے لگی: "میں آپ کو بتا دوں ایک بات، اور آپ کان کھول کر سن لیں کہ میں نے دوزخ میں جانا ہے۔ میں نے بالکل نہیں جانا بہشت وغیرہ میں، مجھے کوئی ضرورت نہیں۔" غصے میں تھی بے چاری۔ بڑی پیاری سی تھی، اور اچھی طاقت تھی اس میں، بہت خوب صورت بازو چڑھائے ہوئے تھے۔ اُس کے ارادے مضبوط تھے۔ ہنسنے والی لڑکی تھی۔ میں نے دوزخ میں جانا ہے۔ مجھے کوئی پروا نہیں آپ کی۔ میں نے کہا: "نہیں نہیں، تو نے دوزخ میں جا کر کیا کرنا ہے۔ دفع کرو۔ کہنے لگی نہیں میں نے نہ دین کے، نہ اسلام کے۔ میں نے اپنی مرضی سے رہنا ہے۔ میں نے کہا، بیٹی دوزخ میں جانا بڑا مشکل کام ہے۔ تو کیسے جائے گی۔ دوزخ میں جانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔" اس نے کہا، جی کیسی محنت کیا؟ وہ جی میرا اور اس کا جھگڑا ہو گیا۔ بڑا زبردست۔ میں نے کہا: "تو دوزخ میں تو!!!!! تو کیہہ تیرا پیو نہیں جا سکدا" میں نے

کہا برا لمبا کام ہوتا ہے۔ اس میں کئی مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ پھر جا کے کہیں بندہ ہوتا ہے دوزخی۔ پہلے جا کے تو شرک کر۔ پھر اللہ کی زمین پر فساد پھیلا، پھر جائے گی۔ کسی کی چیز چرا لے گی، پنسل کالج سے لے آئے گی، یا کسی کا دوپٹہ کھسکا لے گی تو اس سے تو نہیں جائے گی دوزخ میں۔ کہنے لگی: ''نہیں بس میں نے تہیہ کر لیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا: ''نہ نہ بچے، غصہ تھوک دے، کوئی بات نہیں۔ ہم ایسے کریں گے کہ تجھ پر بوجھ نہیں پڑنے دیں گے، تو تم کو آسانی سے چلنے دیں گے۔ مجھے یہ بتاؤ جس زمانے میں ہم ایم اے میں پڑھتے تھے، اس وقت پرچے میں پانچ سوال ہوتے تھے، بیس بیس نمبر کے، اور وہ پانچ کرنے ہوتے تھے، کہا جاتا تھا کہ آؤٹ آف Eight کوئی پانچ سوال کریں۔ اب سمسٹر سسٹم چل گیا ہے، جس کی مجھے کچھ سمجھ نہیں ہے۔ کہنے لگی: ''سنیں۔ سمسٹر سسٹم چلا تھا، وہ پھر کینسل ہو گیا۔ اب پھر پیپر ہی ہوتا ہے، اور پانچ سوال ہی کرنے ہوتے ہیں، اور پانچوں سوال بیس بیس نمبر کے ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''اوہ تیرا بھلا ہو جائے اسلام میں بھی پانچ ہی سوال ہوتے ہیں۔ وہ بھی بیس بیس نمبر کے ہوتے ہیں۔'' کہنے لگی: ''ہیں، یہ کیا؟'' میں نے کہا۔ دیکھ اب تو ایسے کریں گے۔ تو ہے غصے والی بیٹی، تو تیرا انتظام ایک اور طرح سے کرنا چاہیے کہ ہم ایسے کریں گے کہ تم کو لڑکیوں کو بہت شوق ہوتا ہے ڈائٹنگ کرنے کا، اور اپنی Figure ٹھیک رکھنے کا، ٹھیک ہے نا، ہم ایسے کریں گے تجھے سال میں ایک مہینہ ڈائٹنگ کرائیں گی ٹھیک ہے نا۔ صبح کھلا دی روٹی سارا دن پانی بھی میں نے پینے نہیں دینا، اور کھانا بھی نہیں کھانے دینا۔ کہنے لگی: Oh! you are talking of Ramzan

میں نے کہا، اب تم جو مرضی نام دے لو اس کا۔ کہنے لگی، انکل وہ تو جو رمضان ہے نا وہ تو روزے میں رکھتی ہوں سارے۔ کہنے لگی، ہمارے گھر میں تو کوئی بھی نہیں رکھتا لیکن میں رکھتی ہوں سحری کھا کے، نانی بابا، اور اس کی فیملی جاگی ہوئی ہوتی ہے، میں ان کے کوارٹر



میں چلی جاتی ہوں۔ بڑے مزے کی روٹیاں پکائی ہوتی ہیں ماسی نے۔ تو میں سحری کھا کے آ جاتی ہوں، تو میرا روزہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تیرے بیس میں سے بیس نمبر آ گئے، ٹھیک ہے نا۔ پھر میں نے کہا تم جیسی لڑکیوں کو بڑا شوق ہوتا ہے سیر و تفریح کا۔ بہت مرتی ہیں، ایسے تصویریں دیکھتی ہیں۔ کیلنڈر دیکھتی ہیں۔ کہتی ہیں ہائے ملائیشیا جائیں گے۔ یہ امریکہ کا ساحل ہے۔ یہ دیکھو یہ ڈزنی لینڈ ہے اِس جگہ جانا چاہیے۔ شوق ہوتا ہے۔ میں ایسا بندوبست کروں گا۔ تمہیں بڑا شاندار نظارہ ملے گا، جو تمہیں دنیا میں کہیں اور نہیں نظر آئے گا۔ کہنے لگی، کیسی جگہ۔ میں نے کہا: ''ایک ایسی جگہ جہاں آدمیوں کا بڑا ہجوم ہو گا۔ اتنا بڑا ہجوم دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔'' وہ کہنے لگی: ''آپ حج کے بارے میں بات کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا: ''ہاں'' کہنے لگی: ''انکل وہ تو مجھے شوق ہے دیکھنے کا، کیونکہ دنیا میں سب سے بڑا ہجوم'' وہ کہنے لگی: ''آپ مجھے نہ دیں پاسپورٹ، اور نہ دیں ٹکٹ۔ وہ تو میں انشاء اللہ خود جاؤں گی۔ وہ میرا پکا تہیہ ہے وہ تو میں نے طے کیا ہوا ہے۔ لیکن میں آپ کے اسلام وغیرہ کو نہیں مانتی۔'' غصے میں تھی نا۔ تو بار بار ایسے کہتی تھی۔ میں نے کہا: ''چلو بیس نمبر تیرے یہ ہو گئے، چالیس ہو گئے۔ تو میں نے کہا کہ تم نیو کیمپس میں کیسے آتی ہو۔'' کہنے لگی: ''نیو کیمپس میں ابو کار میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کئی دفعہ نہیں آتے تو میں خود کار لے کر آ جاتی ہوں۔ اگر دونوں میں سے کوئی صورت حال نہ ہو تو ڈیڈی مجھے دس روپے دیتے ہیں۔ میں 1984-83، کی بات کر رہا ہوں تو اس زمانے میں ڈیڑھ روپیہ آنے جانے میں لگتا تھا۔ ہماری بس ہوتی ہے۔ میں نے کہا، اگر میں تجھے کہوں یہ جو تجھے دس روپے ملتے ہیں، ان میں سے تھوڑے سے پیسے اٹھنی اس سے بھی کم یہ ایک طرف رکھ کے، Put by کر کے ایک طرف رکھ دے تو دے دیا کر کسی غریب کو۔ تو کہنے لگی: ''آپ مجھے پھنسا رہے ہیں'' میں نے کہا: ''میں آپ کو کہاں پھنسا رہا ہوں، تو میرے پاس آئی ہے۔ اتنی محبت کے ساتھ،

تیرا بابا اتنی محبت سے تم سے بات کرتا ہے، تو پھنسانے کی بات کرتی ہے" کہنے لگی: "آپ مجھے زکوٰۃ میں پھنسانا چاہ رہے ہیں، جسے انکل آپ ڈھائی فیصد کہتے ہو۔ یہ غلط ہے۔ یہ تو فلاں نے بنائی ہے ڈھائی فیصد۔ اللہ کا حکم اور ہے۔" میں نے کہا: "بھئی وہ کیا ہے" کہنے لگی: "اللہ تو کہتا ہے جو کچھ تمہارے خرچ سے باقی بچے وہ سارے کا سارا دے دو" یہ تو میں نے پہلی بار سنا۔ میں نے کہا: "اوہ تیرا بھلا ہو جائے تو نے تو مجھے ڈرا دیا" ڈھائی فیصد پر میں یقین نہیں رکھتی۔ یہ کیلکولیشن غلط ہے۔ کہیں نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا: "یہ تو تیری اور کمال کی بات ہوگئی۔ تیرے تو ساٹھ نمبر ہو گئے۔ ٹھیک ہے کہ نہیں" تو اسی طرح میں نے کہا: "اب اگلا کام آتا ہے جہاد کا۔ وہ مرد بھی جاتے ہیں عورتیں بھی جاتی ہیں، لیکن ذات کے خلاف لڑنا بھی ایک جہاد ہے۔ خرابی کے خلاف۔ تو وہ تو سامنے ہے" کہنے لگی: "دیکھو! میں کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہوں" تو میں نے کہا: "80 نمبر ہو گئے" میں نے کہا: "بے وقوف لڑکی کلثوم بی بی تم نے آج تک 80 نمبر لیے ہیں کسی پرچے میں؟" کہنے لگی: "80 تو انکل بہت ہوتے ہیں۔" میں تو یہی رو رہا تھا کہ دوزخ میں کیسے جائے گی تو تو مصیبت یہ ڈالے بیٹھی ہے۔ تیرا ارادہ دوزخ میں جانے کا ہے۔ کہنے لگی، وہ میں غصے میں کہہ رہی تھی۔ اس کا جھگڑا دین کے ساتھ تو نہیں تھا بے چاری کا۔ آدمی دکھی ہوتا ہے۔ اپنی ماما جی سے اپنی اماں سے اپنے ابو سے لڑتا ہے تو پھر اس کو غصہ آتا ہے۔ پھر جن باتوں کی وہ تلقین کرتے ہیں، جس کے اوپر قائم رہنے کے لیے؟ اس کو وہ ہٹ کرتا ہے۔ میں نے کہا: "کلثوم بچے اب ایسے کریں گے کہ پھر تمہیں ایک لفظ سکھائیں گے۔ وہ ہے تو مشکل عربی کا لیکن تو ذہین لڑکی ہے۔ میرا خیال ہے تو سیکھ جائے گی اگر مشق کرے تو۔" کہنے لگی: "وہ کیا ہے؟" میں نے کہا: "وہ ہے **لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ**" کہنے لگی: "لو کیا بات کی۔ یہ تو میں صبح منہ دھوتے وقت، صبح سویرے جب پانی ڈالتی ہوں تو یہی پڑھتی ہوں۔" تو میں نے



کہا: ''اب بتاؤ بچے تم نے تو پھنسا دیا، ہم دوزخ کیسے جائیں گے۔ یہ تو تم نے میری بھی راہ بند کردی، اب میں بھی کلثوم بی بی کا بابا دادا بن کے بیٹھ گیا۔ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ مجھے بھی فائدہ ہو جائے گا۔ باقی رہ گئی نماز کی بات۔ تو میں نے کہا، عید کو لڑکیاں بڑے شوق سے گھر میں مصلیٰ ڈالے سروں کے اوپر دوپٹے لپیٹ کر کھڑی ہو جاتی ہیں نا تو تین نمبر تو اس میں بھی آ جائیں گے۔ 83-84 نمبر ہو جائیں گے۔ جیں تیرے کلمے کے ہوئے پڑے ہیں۔'' کہنے لگی: ''نہیں نہیں خیر نمازیں میں رمضان شریف میں تو ساری پڑھتی ہوں پوری، اوراس کے علاوہ بھی جب بھی موقع لگ جائے، لیکن ریگولر نہیں ہوں۔'' میں نے کہا: ''کوئی بات نہیں، تیرے نمبر 94-95 سے زیادہ بن رہے ہیں، تو اب تیرا کیا کریں۔'' تو اس کی سہیلی یاسمین کہنے لگی: ''تم اٹھو، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ انکل اشفاق کے پاس نہیں جانا یہ بہت چالاک ہیں۔ یہ ہمیں دھوکے سے پھنسا رہے ہیں۔'' تو ان کے جو ساتھی لڑکے تھے وہ بڑے غور سے یہ باتیں سنتے رہے اور حیران ہوتے رہے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ تھوڑی سی باتیں کیں کہ سر ہم بھی کچھ تھوڑے سے ایسے ہی تھے۔ گستاخ کچھ الٹے سیدھے الفاظ ہمارے منہ میں بھی، اور ذہن میں بھی آ جاتے ہیں۔ میں نے کہا: ''کوئی بات نہیں۔ ذہن میں آ جاتے ہیں تو بے اختیاری کی بات ہے۔ ذہن کے اوپر کنٹرول نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں، چلتے رہیں۔'' لیکن کہنے لگے، رُخ ہمارا البتہ ادھر کا ہو گیا ہے جس طرف کی بات آپ کر رہے ہیں۔ تو کلثوم بی بی اپنی آستین چڑھائے ہوئے غصے میں لٹیں کھلی ہوئی، لیکن وہ ذرا تھوڑی سی ٹھنڈی ہوئی، لیکن اس کا غصہ پورے کا پورا کم نہیں ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا، پولیس نے انہیں تنگ کیا تھا۔ بات بھی اس کی سن لیں۔ جب آپ بات کسی کی سنیں۔ سننے کے لیے کوئی بھی ہو۔ آپ کے گھر میں جھاڑو دینے والی ہے۔ ماسی کھانا پکانے والی ہے۔ اس کی بات ہے۔ کہنے سننے کے لیے آپ کے پاس بھی وقت ہونا چاہیے۔ کلثوم کی اور

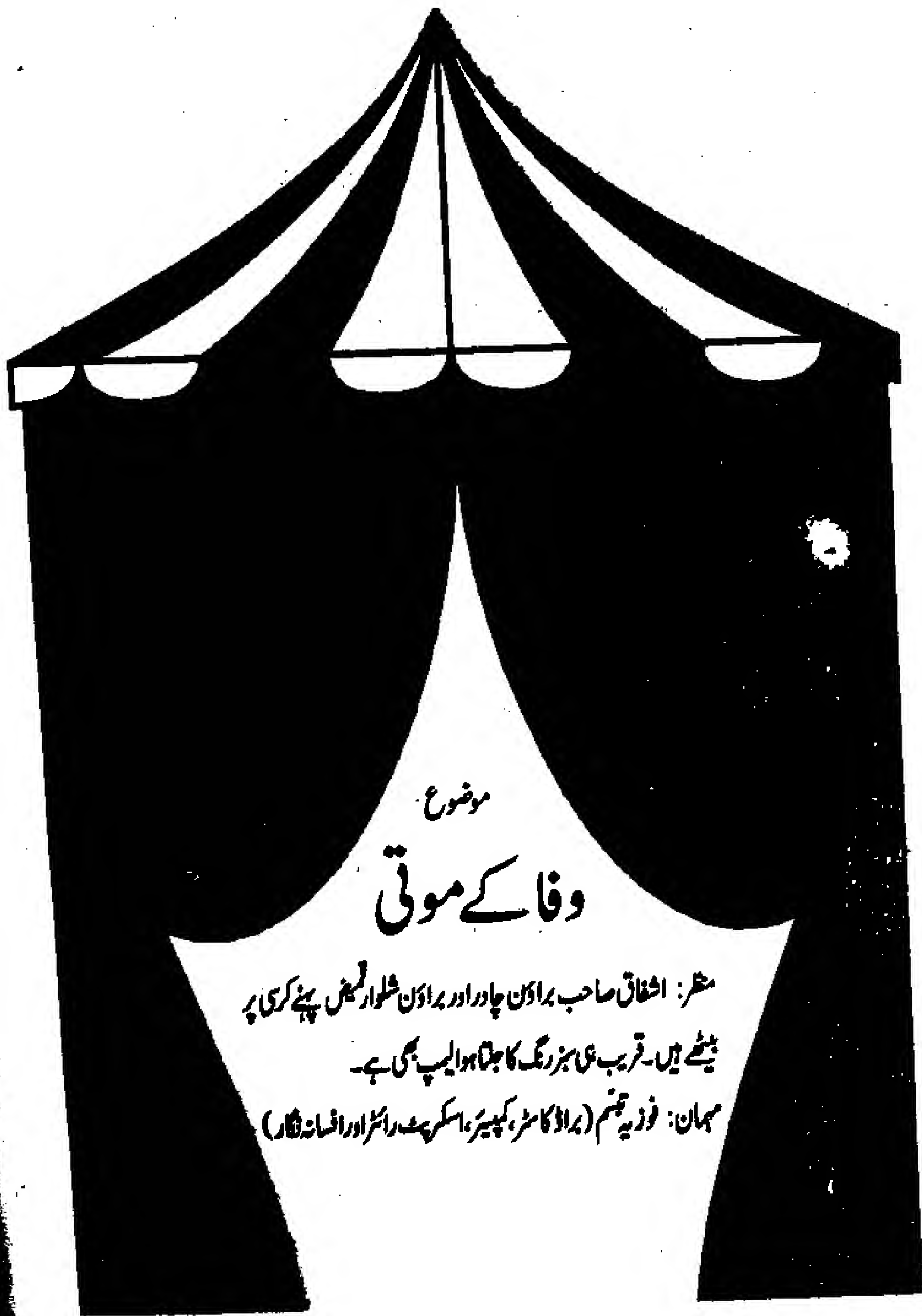
یاسمین کی بات، اور ان کے ساتھیوں کی بات نہیں سنی گئی تھی؟ اس لیے ان کو غصہ تھا، اور غصہ سارا وہ ڈائریکٹ گیا تھا اس دین کی طرف اور اتھارٹی کی طرف، اور بڑوں کی طرف۔ اب اس میں ساری جہالت جو ہے وہ بڑوں کی ہوتی ہے۔ بڑوں کو سنبھالنا نہیں آتا۔ وہ اپنی اتھارٹی میں لگ جاتے ہیں، اور ہمارے ملک میں اتھارٹی کا رواج ذرا ضرورت سے زیادہ ہے۔ ہاں اکیلے بڑوں کی اتھارٹی نہیں۔ آپ بھی جب سوچیں گی، اور آپ جب گھر جا کے غور کریں گی تو آپ دیکھیں گی، آپ اپنی اتھارٹی کو ان معصوموں پر، ان لوگوں پر ضرور استعمال کر جاتی ہیں، جو کہ آپ سے نیچے ہیں۔ لیکن الحمدللہ آپ نے اس بات کو تسلیم کیا۔ لڑکے تو مانتے نہیں، لیکن ہم کیا کرتے ہیں ہمارے ہاں عام لوگ جو ہیں وہ بھی اپنی اتھارٹی کو بڑی شدت سے، اور بڑی بری طرح سے استعمال کرتے ہیں۔

میں شاید پیچھے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مجھے اس ایک بات کا بڑا غصہ تھا۔ یہاں ایک جگہ ہے اچھرہ، اس میں خواتین بہت جاتی ہیں۔ کچھ کپڑے وپڑے لینے کے لیے۔ میں بھی جاتا ہوں، بیگ پکڑ کر اپنی بیوی کے ساتھ۔ انہوں نے کچھ لینا ہوتا ہے کچھ سلی سلائی چیزیں۔ تو وہاں پر ایک خاتون کسی سکول کی ٹیچر تھی۔ اچھی پیاری معزز، سیاہ برقع اس نے اوڑھا ہوا، ہاتھ میں تھیلا پکڑا ہوا۔ ہم جس دکان سے کچھ سودا لے رہے تھے تو اس نے کچھ پوچھا، سرخ رنگ کا کوئی کپڑا، پتا نہیں کیا کہا، لیکن دکاندار نے سنا ہی نہیں۔ پھر اس نے ذرا وضاحت سے کہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، تیرے کام کی یہاں چیز نہیں ہے اس دکان پر آگے جا کے پتا کر۔ تو میں غصے میں بھی آیا اور مجھے رونا بھی آگیا۔ میں نے کہا یہ تو آپ کو حق نہیں پہنچتا۔ اس نے کہا نہیں اشفاق صاحب یہ ایسے ہی ہے کوئی کم پیسوں والی۔ تو یہ اتھارٹی دیکھیں نا، حالانکہ وہ کوئی افسر نہیں ہے۔ کسی بڑی جگہ پر نہیں ہے، لیکن وہ اپنی اتھارٹی بے جا طور پر استعمال کر رہا ہے، اور اگر آپ اپنے اردگرد دیکھیں گی تو بڑا ظلم چل رہا



ہے۔ بہت زیادہ تکبر شامل ہو گیا ہے ہر بندے کے ذہن میں۔ اور تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے وہ بہت ساری چیزیں اکٹھی کرتا رہتا ہے، تاکہ دوسروں کو ڈرانے کے لیے تکبر نمایاں کرے۔ یہ بات، خوشی کا اظہار اس لیے کر رہا ہوں کہ تھوڑے دن ہوئے میں اپنے گھر کے لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڑی خوب صورت سی، پیاری، لمبی عورت ایک خوب صورت سا بچہ نیلا ٹوپ اس نے پہنا ہوا، اون کے موزے جرابیں، وہ آ گئی۔ آ کے وہ عورت میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہنسنے لگی اور کہنے لگی: ''آپ نے مجھے پہچانا؟'' میں نے کہا: ''نہیں'' کہنے لگی: ''انکل! میں کلثوم ہوں'' میں نے کہا: ''اوہ تیرا بھلا ہو جائے بیٹھ'' میں نے کہا، تو اتنی دیر کہاں رہی۔ کہنے لگی میں سیدھی شکاگو سے آ رہی ہوں، اور میں نے آپ کا پتا ڈھونڈ کے سب سے پہلے آپ کے ہاں حاضری دی، میرا خاوند وہاں ڈاکٹر ہے۔ اچھا آدمی ہے، میں آپ سے اپنی پرانی محبت، اپنی برخوداری، اپنی بیٹی ہونے کا ایک چھوٹا سا حق مانگنے آئی ہوں، سیدھی آپ کے پاس'' میں ڈر گیا۔ میں نے کہا: ''فرمائیں! میں تجھ سے بڑا ڈرتا ہوں، اور اتنے سال میرے ڈر میں ہی گزرے ہیں۔'' کہنے لگی: ''یہ میرا بیٹا ہے۔ بہت پیارا ہے اور بہت صحت مند ہے اور ہم اس کو صحت اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر پال رہے ہیں۔ یہ روتا بہت ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے کہ کسی طرح سے اس کا رونا کم ہو، کئی دوائیاں دی ہیں۔ میرے خاوند ڈاکٹر ہیں، لیکن اس کا رونا کم نہیں ہوا تو میں اس کو آپ کے پاس لائی ہوں کہ اس کو دم کر دیں۔'' میں نے کہا: ''اوہ تیرا بھلا ہو جائے۔ میں کوئی نیک آدمی نہیں ہوں۔ میں کیسے دم کروں۔ مجھے دم کرنا نہیں آتا۔'' کہنے لگی: ''آپ ''شو'' کر دیں'' میں نے کہا: ''نہیں بچے یہ تو؟'' اب میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھے واقعی نہیں آتا دم کرنا کہ کیا پڑھتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں۔ کہنے لگی آپ میرے ساتھ ہمیشہ؟ اب پھر وہی غصہ پرانا اس کا کہ میں کتنی دور سے چل کر آئی ہوں، اور کتنی آرزو لے کر

آئی ہوں۔ کہنے لگی: ''اب آپ پھر تکبر کے میز کے اوپر چڑھ گئے ہیں۔ آپ کریں اس کو دم'' میں نے کہا، پیارے بچے! اگر مجھے کچھ آتا تو میں ضرور کرتا۔ اس نے کہا، آپ جھوٹے ہی کر دیں۔ ''شوشو'' کر دیں۔ اب میں نے کہا، جھوٹی پھوک کیسے ماروں گا۔ پھر میں نے کہا، چل ہمارے مولوی صاحب ہیں۔ مسجد میں بہت نیک آدمی ہیں۔ میں جمعہ پڑھنے جاتا ہوں وہاں۔ ان سے دم کرواتے ہیں۔ تو کہنے لگی، نہیں آپ سے کرواؤں گی۔ آپ ہی کریں۔ دیکھیں انسانی کوتاہی کیا ہوتی ہے۔ میں بھلا اس کا دل رکھنے کو کر دیتا۔ ایسے ہی ''شو'' لیکن میں رکا رہا۔ میں نے کہا، مجھے نہیں آتا۔ یہ اللہ نے میرے اندر صلاحیت نہیں رکھی ہے، میری صلاحیت ہے کہ میں کچھ لکھ لیتا ہوں ڈرامے، لیکن یہ کام نہیں جانتا تو اٹھ کے کھڑی ہوگئی، جس طرح سے میرے دفتر میں اپنا پاؤں مار کے گئی تھی زور سے، اتنے ہی زور سے اس نے ویسے ہی پاؤں مارا۔ کہنے لگی نانا ''نانا یو آر ہولی مین'' یہ اس کا آخری فقرہ تھا، اور غصے میں کار میں بیٹھ کے چلی گئی۔ اب بتاؤ میں تم کو کس کھاتے میں ڈالوں۔ تم جو آ گئی ہو ساریاں (ہال میں بیٹھی خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے) مجھے ڈر ہے کہ تم بھی اندر سے لڑائی کرو گی۔ کسی نہ کسی دن میرے ساتھ، اور پیاری تم بہت ہوتی ہو۔ یہ آپ اپنے بڑوں سے اپنے بھائیوں سے اپنے ابو سے پوچھیں۔ باوجود اس کے کہ اختلاف ہوتے ہیں۔ اب ہمارے درمیان، کوشش ہو رہی ہے کہ ہمارے درمیان ہماری محبت کے درمیان کچھ ایسی دیواریں کھڑی کر دی جائیں، تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ تو پیارے بچو! میں اب تمہارے سامنے شکایت کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ آپ کو جب بھی ووٹ دینا پڑے، آپ میرے حق میں دینا۔ کلثوم کے حق میں نہ دینا۔ وہ مجھے جھڑکیاں دے کر گئی ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔



موضوع

وفا کے موتی

منظر: اشفاق صاحب براؤن چادر اور براؤن شلوار قمیض پہنے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ قریب ہی سبز رنگ کا جلتا ہوا لیمپ بھی ہے۔

مہمان: فوزیہ تبسم (براڈکاسٹر، کمپیئر، اسکرپٹ رائٹر اور افسانہ نگار)

وفا کے موتی

انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اُس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ اب بڑے پُرسکون انداز میں زندگی بسر کرے اور وہ ایسے جھمیلوں میں نہ رہے جس طرح کے جھمیلوں میں اُس نے اپنی گزشتہ زندگی بسر کی ہوئی ہوتی ہے اور یہ آرزو بڑی شدت سے ہوتی ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ دوستی لگا لیتے ہیں وہ بڑے مزے میں رہتے ہیں اور وہ بڑے چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ ہم کو انہوں نے بتایا ہوتا ہے کہ ہم اِدھر اپنے دوستوں کے ساتھ دوستی رکھیں اور وہ خود بیچ میں سے نکل کر اللہ کو دوست بنا لیتے ہیں۔ اُن کے اوپر کوئی تکلیف کوئی بوجھ اور کوئی پہاڑ نہیں



کرتا۔ سارے حالات ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے میرے آپ کے ہیں لیکن اُن لوگوں کو ایک ایسا سہارا ہوتا ہے ایک ایسی مدد حاصل ہوتی ہے کہ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

میں نے یہ بہت قریب سے دیکھا ہے ہمارے گھر میں دھوپ سینکتے ہوئے میں اپنی ایک چڑیا کو دیکھا کرتا ہوں جو بڑی دیر سے ہمارے گھر میں رہتی ہے اور غالباً یہ اس چڑیا کی یا تو بیٹی ہے یا نواسی ہے جو بہت ہی دیر سے ہمارے مکان کی چھت کے ایک کونے میں رہتی رہی ہے۔ ہمارا مکان ویسے تو بڑا اچھا ہے۔ اس کی آر وی کی چھتیں ہیں لیکن کوئی نہ کوئی کونا کھدرا ایسا رہ ہی جاتا ہے جو ایسے مکینوں کو بھی جگہ فراہم کر دیتا ہے۔ یہ چڑیا بڑے شوق بڑے سبھاؤ اور بڑے ہی مانوس انداز میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ ہمارے کمرے کے اندر بھی اور فرش پر بھی چلی آتی ہے۔ کل ایک فاختہ آئی جو ٹیلیفون کی تار پر بیٹھی تھی اور یہ چڑیا اُڑ کر اس کے پاس گئی اس وقت میں دھوپ سینک رہا تھا۔ اس چڑیا نے فاختہ سے پوچھا کہ "آپا یہ جو لوگ ہوتے ہیں انسان جن کے ساتھ میں رہتی ہوں یہ اتنے بے چین کیوں ہوتے ہیں؟ یہ بھاگے کیوں پھرتے ہیں؟ دروازے کیوں بند کرتے اور کھولتے ہیں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟" فاختہ نے کہا کہ "میرا خیال ہے کہ جس طرح ہم جانوروں کا ایک اللہ ہوتا ہے ان کا کوئی اللہ نہیں ہے اور ہمیں یہ چاہیے کہ ہم مل کر کوئی دُعا کریں کہ اُن کو بھی ایک اللہ مل جائے۔ اس طرح انہیں آسانی ہو جائے گی کیونکہ اگر ان کو اللہ نہ مل سکا تو مشکل میں

زندگی بسر کریں گے۔"

اب معلوم نہیں میری چڑیا نے اس کی بات مانی یا نہیں لیکن وہ بڑی دیر تک گفت وشنید کرتی رہیں اور میں بیٹھا اپنے تصور کے زور پر یہ دیکھتا رہا کہ ان کے درمیان گفتگو کا شاید کچھ ایسا ہی سلسلہ جاری ہے۔ تو ہم کس وجہ سے ہمارا اتنا قصور بھی نہیں ہے ہم کمزور لوگ ہیں جو ہماری دوستی اللہ کے ساتھ ہو نہیں سکتی۔ جب میں کوئی ایسی بات محسوس کرتا ہوں یا سنتا ہوں تو پھر اپنے "بابوں" کے پاس بھاگتا ہوں۔ میں نے اپنے باباجی سے کہا کہ جی! میں اللہ کا دوست بننا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی ذریعہ چاہتا ہوں۔ اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ یعنی میں اللہ والے لوگوں کی بات نہیں کرتا۔ ایک ایسی دوستی چاہتا ہوں جیسے میری آپ کی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ ہے تو انہوں نے کہا: "اپنی شکل دیکھ اور اپنی حیثیت پہچان تو کس طرح سے اس کے پاس جا سکتا ہے اس کے دربار تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اس کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا: "جی! میں پھر کیا کروں؟ کوئی ایسا طریقہ تو ہونا چاہیے کہ میں اس کے پاس جا سکوں؟" باباجی نے کہا: "اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ خود نہیں جاتے اللہ کو آواز دیتے ہیں کہ "اے اللہ! تو آ جا میرے گھر میں" کیونکہ اللہ تو کہیں بھی جا سکتا ہے بندے کا جانا مشکل ہے۔" باباجی نے کہا کہ جب تم اس کو بلاؤ گے تو وہ ضرور آئے گا۔ اتنے سال زندگی گزر جانے کے بعد میں نے سوچا کہ واقعی میں نے کبھی اسے بلایا ہی نہیں کبھی اس بات کی زحمت ہی نہیں کی۔ میری زندگی ایسے



ہی رہی ہے جیسے بڑی دیر کے بعد کالج کے زمانے کا ایک کلاس فیلو مل جائے بازار میں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا آپ مل گئے۔ کبھی آنا۔ اَب وہ کہاں آئے، کیسے آئے۔ اس بیچارے کو تو پتا ہی نہیں۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ وہ تب ملتے تھے جب ہم راولپنڈی جاتے تو کہتے کہ جی آنا کوئی ملنے کا پروگرام بنانا۔ یہ بہت اچھی بات ہے لیکن ایڈریس نہیں بتاتے تھے۔ جیسے ہم اللہ کو اپنا ایڈریس نہیں بتاتے کسی بھی صورت میں کہ کہیں سچ مچ ہی نہ پہنچ جائے۔ ایک دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ بس مہینے کے آخری ویک کی کسی ڈیٹ کو ملاقات کا پروگرام بنالیں گے، Sunset کے قریب۔ نہ ڈیٹ بتاتے تھے نہ ٹائم بتاتے تھے Determine نہیں کرتے تھے تو ایسا ہی اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے بلکہ کسی حد تک ڈر جاتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر ہم نے اللہ سے دوستی لگالی اور وہ آ گیا تو ہمیں تو بڑے کام کرنے پڑیں گے۔ دوپٹہ چُننا ہوتا ہے، بوٹ پالش کرنا ہوتے ہیں، مہندی پر جانا ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ میاں آ گئے اور انہوں نے کہا کہ "کیا ہو رہا ہے؟" تو مشکل ہوگی۔ ہم نے آخر زندگی کے کام بھی نمٹانے ہیں۔ باقی جو بات میں سوچتا ہوں اور میں نے اپنے بابا کو یہ جواب دیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرنا بہت اچھی بات ہے اور ہے بھی اچھی بات۔ انہوں نے کہا کہ عبادت کرنا ایک اور چیز ہے تم نے تو مجھ سے کہا کہ میں خداوند کریم کو بلواسطہ طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ عبادت کرنا تو ایک گرائمر ہے جو آپ کر رہے ہیں اور اگر

آپ عبادت کرتے بھی ہیں تو پھر آپ اپنی عبادت کو Celebrate کریں، جشن منائیں، جیسے مہندی پر لڑکیاں تھال لے کر ناچتی ہیں نا موم بتیاں جلا کر اس طرح سے۔ ورنہ تو آپ کی عبادت کسی کام کی نہیں ہوگی۔

جب تک عبادت میں Celebration نہیں ہوگی، جشن کا سماں نہیں ہوگا جیسے وہ بابا کہتا ہے ''تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا'' چاہے سچ مچ نہ ناچیں لیکن اندر سے اس کا وجود اور روح ''تھیا تھیا'' کر رہی ہے لیکن جب تک Celebration نہیں کرے گا، بات نہیں بنے گی۔ اس طرح سے نہیں کہ نماز کو لپیٹ کر ''چار سنتاں، فیر چار فرض، فیر دو نفل، تن وتر'' سلام پھیرا چلو جی رات گزری فکر اُترا۔ نہیں جی! یہ تو عبادت نہیں۔ ہم تو ایسی ہی عبادت کرتے رہے ہیں اس لیے تال میل نہیں ہوتا۔ جشن ضرور منایا جانا چاہیے عبادت کا۔ دل لگی محبت اور عقیدت کے ساتھ عبادت۔ ہمارے یہاں جہاں میں رہتا ہوں وہاں دو بڑی ہاکی اور کرکٹ گراؤنڈز ہیں وہاں سنڈے کے سنڈے بہت سویرے جب ہم سیر سے لوٹ رہے ہوتے ہیں منہ اندھیرے گڈی اُڑانے والے آتے ہیں۔ وہ اس کا بڑا اہتمام کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑے بڑے تھیلے ہوتے ہیں اور بہت کاریں ہوتی ہیں جن میں وہ اپنے بڑے والے تھیلے رکھ پتنگ اُڑانے کے لیے کھلے میدان میں آتے ہیں۔ اب وہ خالی پتنگ نہیں اُڑاتے بلکہ اہتمام کے ساتھ اس کا جشن مناتے ہیں۔ جب تک اس کے ساتھ جشن نہ ہو وہ پتنگ نہیں اُڑتی اور نہ ہی پتنگ اُڑانے والا سماں

بندھتا ہے کھانے پینے کی بیشمار چیزیں باجا بجانے کے بھومپو اور بہت کچھ لے کر آتے ہیں وہاں جشن زیادہ ہوتا ہے کائٹ فلائنگ کم ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں عبادت زیادہ ہوتی ہے Celebration اللہ کو ماننا کم ہوتا ہے۔

میں نے سوچا یہ گڈی اُڑانے والے بہت اچھے رہتے ہیں ہمارے پاس باباجی کے ہاں ایک گڈی اُڑانے والا آیا کرتا تھا موچی دروازے کے اندر علاقے سے بڑی خوبصورت دھوتی باندھتا تھا، جیسے انجمن فلموں میں باندھا کرتی تھی، لمبے لڑ چھوڑ کر باندھا کرتی تھی، وہ جب آتا تو ہمارے باباجی اُسے کہتے گڈی اُڑاؤ اس طرح باباجی ہمیں Celebrate کرنے کا حوصلہ دیتے تھے۔ جو بات اب سمجھ میں آئی ہے۔ وہ اتنی اونچی پتنگ اڑاتا تھا کہ نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی اور میرے جیسا آدمی تو اس لمبی ڈور کو سنبھال بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھا صدیق! تم یہ گڈی کیوں اُڑاتے ہو؟ کہنے لگا جی! یہ گڈی اُڑانا بھی اللہ کے پاس پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کہنے لگا نظر نہیں آتی لیکن اس کی کھینچ بتاتی رہتی ہے کہ میں ہوں۔ اللہ نظر نہیں آتا لیکن آپ کے دلوں کی دھڑکن یہ بتاتی ہے کہ ''میں ہوں'' یہ نہیں کہ وہ آپ کے رُوبرو آ کر موجود ہو۔

جب میں ریڈیو میں کام کرتا تھا تو ہمیں ایک Assignment ملی تھی۔ وہ یہ کہ پتا کریں چھوٹے دکانداروں سے کہ وہ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چھوٹے دکانداروں سے مراد چھابڑی فروش۔ یہ کچھ دیر کی بات ہے میں نے بہت

سے چھابڑی فروشوں کا انٹرویو کیا۔ ان سے حال معلوم کیے۔ پیسے کا ہی سارا اونچ نیچ ہے اور ہم جب بھی تحقیق کرتے ہیں یا تحلیل کرتے ہیں یا Analysis کرتے ہیں تو Economics کی Base پر ہی کرتے ہیں کہ کتنے امیر ہیں کتنے غریب ہیں کیا تناسب ہے کہ وہ کس Ratio کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں؟ ان کے کیا مسائل ہیں؟ دِلّی دروازے کے باہر اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے دہلی دروازہ دیکھا ہو اس کے باہر ایک آدمی کھڑا تھا نوجوان وہ کوئی تیس بتیس برس کا ہوگا۔ وہ سنگھاڑے بیچ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟ کہنے لگا: ''میرا نام سلطان ہے'' میں نے کہا: ''کب تک تم یہ سنگھاڑے بیچتے ہو؟'' کہنے لگا: ''شام تک کھڑا رہتا ہوں'' میں نے پوچھا: ''اس سے تمہیں کتنے روپے مل جاتے ہیں؟'' اس نے بتایا ستر بہتر روپے ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا: ''انہیں کالے کیسے کرتے ہیں؟'' میری بیوی پوچھتی رہتی ہے مجھ سے کیونکہ وہ دیگچے میں ڈال کر اُبالتی ہے تو وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ جی پنساریوں کی دکان سے ایک چیز ملتی ہے چمچہ بھر اس میں ڈال دیں تو کالے ہو جائیں گے اُبل کر اور آپ جا کر کسی پنساری سے پوچھ لیں کہ سنگھاڑے کالے کرنے والی چیز دے دیں وہ دیدے گا۔ جب اس نے یہ بات کی تو میں نے کہا یہ اندر کے بھید بتانے والا آدمی ہے اور کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتا۔ کھلی نیت کا آدمی ہے۔ یقیناً یہ ہم سے بہتر انسان ہو گا۔ میں نے کہا جب آپ ستر بہتر روپے روز بنا لیتے ہیں تو پھر ان روپوں کا کیا کرتے

ہیں؟ کہنے لگا: ''میں جا کر رضیہ کو دے دیتا ہوں'' میں نے کہا: ''رضیہ کون ہے؟'' کہنے لگا: ''میری بیوی ہے'' میں نے کہا: ''شرم کرو اتنی محنت سے پیسے کماتے ہو اور سارے کے سارے اسے دے دیتے ہو'' کہنے لگا: ''جی اسی کے لیے کماتے ہیں'' اللہ کہتا ہے نا قرآنِ پاک میں کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَی النِّسَاءِ یہ جو مرد ہیں یہ عورت کے کماؤ ہیں'' میں نے اس سے کہا: ''اچھا تو بیچ میں سے کچھ نہیں رکھتے؟'' کہنے لگا: ''نہیں جی! مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی'' میں نے کہا: ''اس وقت رضیہ کہاں ہے؟'' وہ inside خوبصورت آدمی تھا اس لیے مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ کہنے لگا: ''رضیہ کہیں بازار وغیرہ گئی ہوگی۔ اس کی دو سہیلیاں ہیں اور وہ تینوں صبح سویرے نکل جاتی ہیں بازار۔ اس نے بتایا کہ وہ کبھی کبھی گلوکوز لگواتی ہیں اُن کو شوق ہے۔ اس طرح مجھے تو بعد میں پتا چلا کہ اندرون شہر کی عورتیں گلوکوز لگوانا پسند کرتی ہیں۔ گلوکوز لگوانا انہیں اچھی سی چیز لگتی ہے کہ اس کے لگوانے سے جسم کو تقویت ملے گی۔ میں نے کہا: ''اچھا تم خوش ہو اس کے ساتھ؟'' کہنے لگا: ''ہاں جی! ہم اپنے اللہ کے ساتھ بڑے راضی ہیں۔ میری تو اللہ کے ساتھ ہی آشنائی ہے۔ میں تو کسی اور آدمی کو جانتا نہیں'' اس پر میں چونکا اور ٹھٹکا۔ اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک بڑا آدمی ہے لاہور کا۔ میں نے اگر کوئی حاکم دیکھا ہے تو وہ ''سلطان سنگھاڑا فروش'' ہے۔ اس کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ کوئی واردات واقعہ اس کے اوپر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

میں اُس سے جب بھی ملتا رہا کوئی شکایت اس کی زبان پر نہیں ہوتی تھی۔

اب تو تین سال سے جانے وہ کہاں غائب ہے۔ مجھے نظر نہیں آیا لیکن میں اس کے حضور میں حاضری دیتا ہی رہا۔ اس کا درجہ چونکہ اس اعتبار سے بلند تھا کہ اس کی دوستی ایک بزرگ ترین ہستی سے تھی۔ میں ذرا اپنی گفتار اور باتوں میں تھوڑا سا باادب ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا: ''یار سلطان! کیا تم اللہ کے ساتھ گفتگو بھی کرتے ہو؟'' کہنے لگا: ''ہم تو شام کو جاتے، صبح کو آتے ہوئے منڈی سے سودا خریدتے ہوئے، اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور اُسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں'' میں نے کہا: ''کون سی زبان میں؟'' وہ کہنے لگا: ''اوہ پنجابی وی جاندا اے، اُردو جاندا اے، سندھی جو وی بولی بولیں او سب جاندا اے'' میں نے کہا: ''تو نے مجھے بتایا تھا ایک دن کہ گیارہ برس ہو گئے تمہاری شادی کو اور تمہارا بچہ کوئی نہیں ہے؟'' کہنے لگا: ''بچہ کوئی نہیں میں اور رضیہ اکیلے ہیں'' میں نے کہا: ''اللہ سے کہو کہ اللہ تجھے ایک بچہ دے'' کہنے لگا: ''نہیں جی! یہ تو ایک بڑی شرم کی بات ہے۔ بزرگوں سے ایسی بات کیا کرنی بڑا سا لگتا ہے۔'' وہ خداوند تعالیٰ کو ایک بزرگ ترین چیز سمجھ کر کہہ رہا تھا کہ جی! بڑوں کے ساتھ ایسی بات نہیں کرنی۔ میں یہ کہتا فضول سا آدمی لگوں گا کہ اللہ مجھے بچہ دے۔

میں نے کہا کہ کیا ایسے ہو سکتا ہے کہ ہماری بھی اس کے ساتھ دوستی ہو جائے؟ کہنے لگا اگر آپ چاہیں تو ہو سکتا ہے۔ اگر آپ نہ چاہیں تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے جیسا کہ میں پہلے عرض کر رہا تھا اپنے سارے برسوں کا میں نے جائزہ لیا سارے دنوں کا میں نے کبھی یہ نہیں چاہا۔ میرا یہی خیال تھا کہ میں عبادت کروں گا اور عبادت

ہی اس کا راز ہے اور عبادت کو ہی لپیٹ کر رکھ دوں گا اپنے مصلے کے اوپر اور دن اور رات اسی طرح عبادت کرتا رہوں گا۔ لیکن وہ جو میرا منتہائے مقصود ہے وہ جو میرا محبوب ہے اس کی طرف جانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں یہی سمجھتا رہا اور آج تک یہی سمجھتا رہا ہوں یہ اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے کر رہا ہوں عبادت سے پرے ہٹ کر ایک آرزو کی بھی تلاش ہے کہ میں اپنے اللہ کے ساتھ جس کی کوئی ایک ہستی ہے نہ نظر میں آنے والی اس کے ساتھ کوئی رابطہ قائم کروں جیسا سلطان نے کیا تھا۔ جیسے اس کے علاوہ چار پانچ بندے اور بھی ہیں میری نظر میں ۔ میں نے اس بات سے اندازہ لگایا کہ اتنا خوش آدمی میں نے زندگی میں کوئی نہیں دیکھا۔ جتنے بھی اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ تھے وہ انتہائی خوش تھے۔

1965ء کی جنگ میں اِس سلطان کے پاس گیا لوگ گھبرائے بھی ہوئے تھے جذباتی بھی تھے۔ وہ ٹھیک تھا ویسے ہی بالکل اسی انداز میں جیسے پہلے ملا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے میرے دل میں چلو کم از کم یہ خواہش ہی پیدا ہو جائے خدا سے دوستی کی اور میں کم از کم اس پلیٹ فارم سے اُتر کر دو نمبر کے پلیٹ فارم پر آ جاؤں ۔ پھر میں وہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ میری نگاہ اوپر ہو جائے تو کہنے لگا حالانکہ اَن پڑھ آدمی تھا اب لوگ مجھ سے بابوں کا ایڈریس پوچھتے ہیں میں انہیں کیسے بتاؤں کہ ایک سلطان سنگھاڑے والا دِلی دروازے کے باہر جہاں تانگے کھڑے ہوتے ہیں ان کے پیچھے کھڑا ہے جو بہت عظیم

''بابا'' ہے اور نظر آنے والوں کو شاید نظر آتا ہوگا مجھے پورے کا پورا تو نظر نہیں آتا بھاجی! بات یہ ہے کہ جب ہم اوپر منہ اٹھاتے ہیں تو ہم کو آسمان اور ستارے نظر آتے ہیں۔ اللہ کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ کہنے لگا: ''آپ کبھی مری گئے ہیں؟'' میں نے کہا: ''ہاں میں کئی بار مری گیا ہوں۔'' کہنے لگا: ''جب آدمی مری جاتا ہے نا پہاڑی پر تو پھر حال کا نظارہ لینے کے لیے وہ نیچے بھی دیکھتا ہے اور اوپر بھی۔ پھر اس کا سفر **Complete** ہوتا ہے۔ خالی ایک طرف منہ کرنے سے نہیں ہوتا۔ جب آپ نیچے کو اور اُوپر کو ملاتے ہیں تو پھر ساری وسعت اس میں آتی ہے۔

اس نے کہا کہ یہ ایک راز ہے جب آدمی یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں وسعت کے اندر داخل ہو رہا ہوں۔ وہ پنجابی میں بات کرتا تھا اس کے الفاظ تو اور طرح کے تھے۔ پھر اس کو قربت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن حوصلہ کر کے وہی پڑتا ہے جیسا کہ باباجی کہتے تھے کہ ''اے اللہ! تو میرے پاس آجا مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں کہ میں آسکوں'' اور وہ یقیناً آتا ہے۔ بقول سلطان سنگھاڑے والے کے کہ اس کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا اس لیے کہ وہ تو پہلے سے ہی آپ کے پاس موجود ہے اور آپ کی شہ رگ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ اسے دعوت ہی نہیں دیتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا اس کا مجھے کوئی راز بتا مجھے کچھ ایسی بات بتا کہ جس سے میرے دل کے اندر کچھ محسوس ہو۔ کہنے لگا: ''جی! آپ کے دل سے۔ اندر کیا میں تو سارے پاکستان کے لاہور کے لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب وہ باہر نکلا... یں تو پورا لباس پہن کر نکا!

کریں۔'' میں نے کہا: ''سارے ہی پورا لباس پہنتے ہیں۔'' کہنے لگا: ''یہ دیکھ تانگے میں چار بندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پورا لباس نہیں پہنا ہوا۔'' میں نے کہا: ''یہ بابو گزرا ہے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا ہے اس نے ٹائی بھی لگائی ہوئی ہے۔'' کہنے لگا: ''نہیں جی آدمی جب کم ازکم باہر نکلے تو جس طرح لڑکیاں میک اَپ کرتی ہیں خاص طور پر باہر نکلنے کے لیے تو اس طرح آدمی کو بھی اپنے لباس کے اوپر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔''

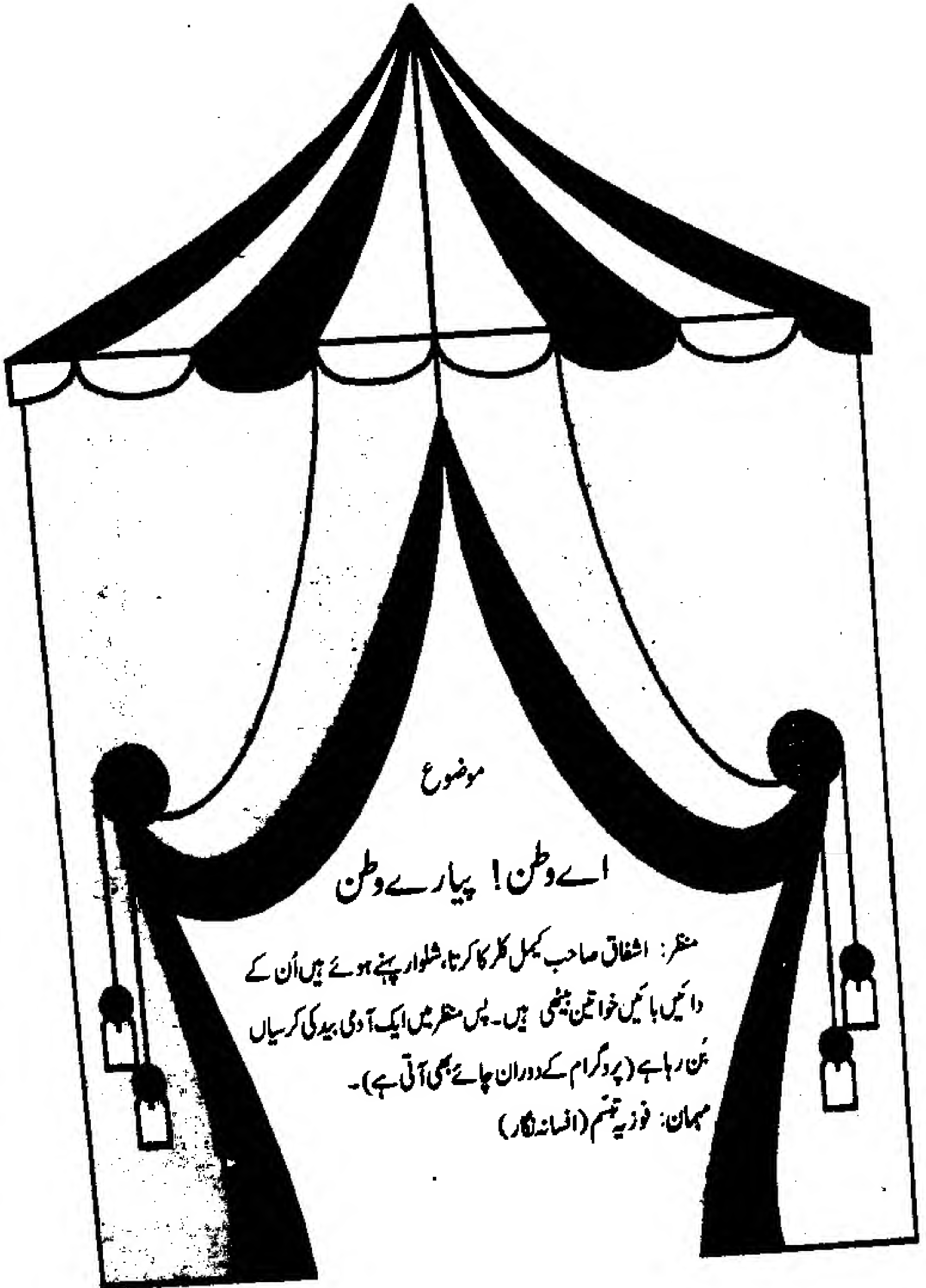
میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ کوئی اخلاقی بات کرنا چاہتا ہے لباس کے بارے میں جیسے ہم آپ لوگ کرتے ہیں۔ کہنے لگا: ''لوگ سارے کپڑے تو پہن لیتے ہیں لیکن اپنے چہرے پر مسکراہٹ نہیں رکھتے اور ایسے ہی آ جاتے ہیں لڑائی کرتے ہوئے اور لڑائی کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ تو جب تک آپ چہرے پر مسکراہٹ نہیں سجائیں گے لباس مکمل نہیں ہوگا۔'' یہ جو تانگے پر بیٹھے ہوئے ہیں چار آدمی کہنے لگا یہ تو برہنہ جا رہے ہیں۔ مسکراہٹ اللہ کی شکر گزاری ہے اور جب آدمی اللہ کی شکر گزاری سے نکل جاتا ہے تو وہ پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ میں نے کہا: ''یار! ہم تو بہت عبادت گزار لوگ ہیں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں۔'' اس پر وہ کہنے لگا: ''جی! میں لال قدسی میں رہتا ہوں وہاں بابا وریام ہیں۔ وہ رات کو بات سنایا کرتے ہیں۔

انہوں نے ہمیں ایک کہانی سنائی کہ پیران پیر کے شہر بغداد میں ایک بندہ تھا جو کسی پر عاشق تھا۔ اس کے لیے تڑپتا تھا، روتا تھا، چیخیں مارتا اور زمین پر سر پٹختا تھا۔ لیکن اس کا محبوب اسے نہیں ملتا تھا۔ اس شخص نے ایک بار خدا سے دُعا کی کہ اے اللہ!

ایک بار مجھے میرے محبوب کے درشن تو کرا دے۔ اللہ تعالیٰ کو اس پر رحم آ گیا اور اس کا محبوب ایک مقررہ مقام پر جہاں بھی کہا گیا تھا پہنچ گیا۔ دونوں جب ملے تو عاشق چٹھیوں کا ایک بڑا بنڈل لے آیا۔ یہ وہ خط تھے جو وہ اپنے اس محبوب کے ہجر میں لکھتا رہا تھا۔ اس نے وہ کھول کر اپنے محبوب کو سنانا شروع کر دیئے۔ پہلا خط سنایا اور اپنے ہجر کے دُکھڑے بیان کیے۔ اس طرح دوسرا خط پھر تیسرا خط اور جب وہ گیارہویں خط پر پہنچا تو اس کے محبوب نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا اور کہا: ''گدھے کے بچے! میں تیرے سامنے موجود ہوں اپنے پورے وجود کے ساتھ اور تو مجھے چٹھیاں سنا رہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔'' سلطان کہنے لگا: ''بھا جی! عبادت ایسی ہوتی ہے۔ آدمی چٹھیاں سناتا رہتا ہے محبوب اس کے گھر میں ہوتا ہے اس سے بات نہیں کرتا۔ جب تک اس سے بات نہیں کرے گا چٹھیاں سنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایسے لوگ بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ میں بڑا سخت حاسد ہوں ان کا۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیے بغیر کوشش Struggle کیے بغیر مجھے بھی ایسا ہی مقام مل جائے مثلاً جی چاہتا ہے کہ میرا بھی ایک پرائز بانڈ نکل آئے ساڑھے تین کروڑ والا۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پرائز بانڈ نکلے ایمانداری کی بات کرتا ہوں مجھے وہ عیاشی میسر آ جائے جو میں نے پانچ آدمیوں کے چہرے پر اُن کی روحوں پر دیکھی تھی کیونکہ ان کی دوستی ایک بہت اونچے مقام پر تھی۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ!!



موضوع

اے وطن! پیارے وطن

منظر: اشفاق صاحب کیمل کلر کا کرتا، شلوار پہنے ہوئے ہیں اُن کے دائیں بائیں خواتین بیٹھی ہیں۔ پس منظر میں ایک آدمی بید کی کرسیاں بُن رہا ہے (پروگرام کے دوران چائے بھی آتی ہے)۔

مہمان: فوزیہ تبسم (افسانہ نگار)

اے وطن! پیارے وطن

ہم سب کی طرف سے سب کو سلام پہنچے۔ یہ آج ہی کے دن تھے، اور تقریباً ایسا ہی موسم تھا، اور ایسے ہی ماہ و سال تھے، لیکن وقت اس سے بہت پہلے کا تھا، اور ہم اس آرزو کو لے کر چل رہے تھے کہ ایک ایسا ملک بنے گا، ایک ایسا سنہرا دیس، جس کے اندر لوگوں کو آسانیاں ملیں گی اور وہ ذہنی طور پر، روحانی طور پر اور نفسیاتی طور پر آسانیوں کے اندر زندگی بسر کریں گے، کیونکہ ہم اس دعویٰ کو لے کر چلنے والے تھے کہ یہ ایک ایسا ملک ہوگا جو ایک مثالی دیس کی صورت میں ہوگا اور ہم لوگوں کو دوسرے ملکوں کو یہ بتا سکیں گے کہ دیکھو پیارو! حکمرانی، جہاں بانی اس طرح سے کی جاتی ہے، اور جس طرح سے آپ لوگ اپنے اپنے ملکوں میں کرتے ہیں۔ وہ کوئی زندگی گزارنے کا، زندگی بسر کرنے کا، کوئی ایسا کمال کا فن نہیں ہے جس کا کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں یہ ایک ایسا دور تھا، اور ایسا عہد تھا، اور ہم اپنے



انداز میں تھے ہماری سرشت میں، اور ہماری سوچ میں، اور ہماری سائیکی میں، اور ہمارے دل میں ایک عجیب بات تھی جیسا کہ میں نے پہلے ایک دفعہ عرض کیا تھا کہ ہم دیئے میں سے دینے کے عمل پر، اور دیئے میں سے دینے کے فن پر عمل پیرا تھے، اور ہم یہ جانتے تھے، اور ہمیں اس بات کا بہت پکا شعور تھا کہ زراعتی ملک ہونے کی وجہ سے یا زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے جب تک ہاتھ سے، اور پلے سے کچھ دیا نہیں جائے گا، اس وقت تک کسی بھی قسم کی فلاح، اور ترقی نہیں ہو سکے گی۔

کسان اپنے گھر کے اندر جا کر اپنی بھڑولی کھول کر اس میں سے اناج نکال کر، یا بوری کی تناویں کاٹ کر اس میں سے دانے نکال کے، جھولی بھر کے کھلے میدان میں جاتا تھا، اور وہ اچھے بھلے دانے اچھا بھلا اناج جس سے اس کے گھرانے کی زندگی کا سامان بڑی آسانی سے کیا جا سکتا تھا، باہر لے جا کر یا تو پورے کے ذریعے یا بیج درج یا چھٹے کے ذریعے ایک عجیب وغریب زمین پر پھینک کر اس امید پر، اور اس سوچ پر چلا آتا تھا کہ اس کے اندر سے اب ایسے ہی بے شمار دانے، ستر، ستر اور سات سات سو، اور سات سات ہزار ہو کر نکلیں گے۔ یہ پہلے دینا ہوتا ہے، پھر اس کے بعد لینا ہوتا ہے۔ یہ تصور ہمارے ساتھ تھا کہ دیں گے، تو ہم دے چکنے کے بعد کیاریوں، درزوں میں سے چھوٹے چھوٹے پودے جھانک کر دیکھتے تھے کہ گھر والے کھیت میں آئے ہوئے ہیں کہ نہیں، یا ہم اکیلے ہی نشوونما پا رہے ہیں۔ تو کبھی کبھی بونے والے وہاں موجود ہوتے تھے، اور کبھی نہیں بھی ہوتے تھے۔ لیکن وہ پودے نشوونما پاتے چلے جاتے تھے، اور جب وہ بڑے ہوتے تھے، تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

تو دوستو! ہمارے پاس وقت کچھ بھی نہ تھا۔ ہم اپنی دولت، شہرت، عزت، شفقت، محبت، مروت یہ سب کچھ لے کر اپنے وطن کی بنیادوں میں ڈالنا چاہتے تھے، لیکن ہمارے پاس سوائے ہمارے بدنوں کے، ہمارے وجود کے، اور سوائے ہمارے اپنے خون کے کچھ بھی نہ تھا۔ ہم نے اپنے وجود کو، اپنے جسم کو، اپنے خون کو اس وطن کی بنیادوں کو پیش کیا۔ جو الحمد اللہ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور یوں اس ملک کی بنیاد پڑی۔ یہ تصور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، اور آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی دھندلانے لگا کہ دینا اتنا ضروری نہیں ہے، اور ان کھیتوں میں ان مرغزاروں میں، ان باغوں میں ایسے لوگ بھی آئے جنہوں نے کاشت میں کوئی مدد نہ کی۔ البتہ اس کا فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس کی طرف چل پڑے، اور یہ ہمارے ذہنوں سے نکلتا گیا کہ ہمیں دینا بھی ہے، کیونکہ دیے بغیر کام آگے نہیں چل سکتا، اور جوں ہی دینے سے ہاتھ روکتے ہیں، تو کہیں نہ کہیں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور ویرانی، اور بربادی کے سامان ضرور شروع ہو جاتے ہیں۔

چند دنوں کی بات ہے۔ آپ کے اسی ملک میں، میں ایک پروگرام دیکھ رہا تھا، اور میں پوری توجہ اس پر نہیں دے سکا، چونکہ کان میرے تیز ہیں، اور نگاہ اب کمزور ہونے لگی ہے لیکن وہ بات جو تھی وہ میں نے ساری کی ساری سن لی تھی۔ کوئی ڈاکٹر تھے، ڈاکٹر شاہ۔ کمپیئر نے یہ سوچا تھا کہ یا شاید حقیقت بھی تھی کہ شاہ اتنے عمر رسیدہ ڈاکٹر نہیں ہیں۔ اتنے بوڑھے Old Sergeon نہیں ہیں، لیکن اس چھوٹی سی عمر میں انہوں نے بہت سارے آپریشن کیے۔ اتنے ہزاروں آپریشن کیے کہ گینیز بک میں اس کا

نام آتا ہے، یا آنے والا ہے، یا آئے گا۔ تو میری توجہ ان کی طرف ہوئی۔ وہ اچھے سے، سمارٹ سے، پیارے سے، اچھی گفتگو کرنے والے ایک ڈاکٹر تھے، اور وہ یہ بتاتے رہے کہ میں نے کتنی تیزی سے کتنے سارے آپریشن کیے، اور اتنی تیزی سے کیوں کیے۔ میں مال بھی بنانا چاہتا تھا، اور ایک یہ بھی کہتے تھے کہ میری انگلیوں میں بھی کچھ اس قسم کی ایک لگن آباد تھی، ایک **Creativity** تھی، ایک تخلیق تھی کہ میں جلدی سے جلدی زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا خواہشمند ہوں۔ تو کمپیئر نے پوچھا کہ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی زندگی کا کوئی بہت مشکل آپریشن تھا؟ تو انہوں نے کہا، یوں تو بہت سارے آپریشن مشکل ہوتے ہیں، لیکن ایک آپریشن بہت مشکل تھا جس نے بہت زیادہ وقت لیا، اور میری بہت زیادہ توجہ لی، اور میں بہت سٹپٹایا، لیکن میں بڑی کوشش کے ساتھ، اور تحمل کے ساتھ اس پر لگا رہا۔

آپ لوگوں سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے خواجہ دل محمد کا ایک شعر یاد آیا ہے۔ خواجہ دل محمد ہمارے بہت کمال کے شاعر تھے، اور مجھے بہت افسوس ہے کہ لوگ اب انہیں نہیں جانتے۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل تو ان سے بالکل واقف نہیں ہے، لیکن وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ وہ ایک جگہ پر سرجن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرجن کیا ہوتا ہے یعنی آپریشن کرنے والا کیا ہوتا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ''سرجن کی صفت اور خوبی یہ ہے کہ نظر باز کی، سر افلاطون کا، جگر شیر کا، اور ہاتھ خاتون کا یعنی سرجن وہ ہوتا ہے جس کی نظر باز کی ہوتی ہے افلاطون کی طرح اس کا سر غور کرتا ہو۔ اس کی نظر باز کی ہو، اور ہاتھ خاتون کا تو ان سرجن کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ اس انداز کے ڈاکٹر ہیں۔ کہنے لگے کہ میں اپنے سرجری ہاسپٹل میں تھا کہ اچانک وہاں پر ایک اپاہج آدمی کو جو بھی اپاہج ہوا تھا۔ کوئی ایک

آدھا گھنٹا قبل، اسے چارپائی پر ڈال کر لائے۔ وہ ایک نوجوان تھا جس کی دونوں ٹانگیں، ایک تیز دھار آلے سے کٹ گئی تھیں، اور اس کے ساتھیوں نے اس کی رانوں پر بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے رومال یا کوئی رسیاں باندھی تھیں، تاکہ جریانِ خون نہ ہو اور وہ جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں حیران تھا کہ میں اس کا کیا کروں۔ اس کے فوراً بعد ہی دو آدمی، بھاگے بھاگے آئے، اور انہوں نے کہا کہ جی اس کی دونوں ٹانگیں مل گئی ہیں۔ جس تیز دھار آلے سے کٹی تھیں، مشین میں کام کرتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں ران سے نیچے کٹ کر دور جا گری تھیں، تو یہ واقعہ اور یہ سانحہ گزرا تھا، پاکستان سٹیل ملز میں۔ ایک کوئی بڑا تیز چکر گھوم رہا تھا۔ کٹاؤ دار جس میں وہ کام کرتے ہوئے قریب آیا تھا کسی کام کی غرض سے۔ وہ مزدور بڑا ذہین، بڑا قابل اور بہت سمجھدار تھا، لیکن وہ اس کی لپیٹ میں آ گیا، اور لپیٹ میں آتے ہی اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں، اور بہت دور جا گریں، اور اس کے ساتھیوں نے تلاش کر لیں، اور وہ اس کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر آ گئے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ میرے لیے بڑے امتحان کا وقت تھا۔ میں، اور میرے ساتھی، اور میرے اسسٹنٹ میرے ساتھ لگے۔ ہم کوئی مسلسل 18 گھنٹے اس پر کام کرتے رہے، اور اللہ کا فضل یہ ہوا کہ ہم ان کی دونوں ٹانگیں جوڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب خطرہ، اندیشہ، شائبہ یہ تھا کہ بہت ممکن ہے کہ Nerves اس کے ساتھ ٹھیک طرح سے نہ جڑی ہوں، جو شریانیں اور وریدیں ہیں، وہ اپنی جگہ پر نہ لگی ہوں، کیونکہ یہ آپریشن ہی بہت بڑا تھا، لیکن ہم خدا سے دُعا مانگ کے اس کام پر لگے ہوئے تھے، اور جب آپریشن ختم ہوا تو ہم ڈاکٹر بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے تو وہ جو اس کے دوسرے ساتھی مزدور تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب ہم



اس کو چارپائی پر لے کر چلے ہیں تو وہ صاحب جو تھے، جن کا نام شکور تھا، وہ تھوڑے ہوش میں تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر کہا کہ مشین بند نہ کرنا، کیونکہ یہ مشین ایک دفعہ بند ہوگئی تو اس کے چلانے میں 10 لاکھ کا خرچہ اٹھتا ہے۔ تو اس مشین کو بالکل بند مت کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ملک کو یا میرے اس کارخانے کو کوئی نقصان پہنچے۔ تو اس کے بعد وہ نیم بے ہوشی میں چلا گیا۔

اب میرا مقصد اس سارے واقعہ کو سنانے کا یہ ہے کہ وہ کون آدمی ہے، اور وہ کس طرح سے اس ملک کے ساتھ وابستہ ہے، اور ہم کیا کریں، اور کدھر جائیں کہ ہم اس کو سلام کر کے آئیں اور جب تک وہ زندہ رہے اور ہم زندہ رہیں، ہمارے اور اس کے درمیان سلام کا یہ سلسلہ قائم رہے۔ اس قسم کے جو لوگ ہیں، انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ اس کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ اس کو لے کر چلے اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک درد ناک بات جو میں آپ کی خدمت میں ضرور عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ اس کارخانے میں اس سٹیل مل میں، اسی قسم کے پاکستانیوں نے جو اس سے بہتر تعلیم یافتہ تھے، وہاں سے اتنا کچھ کھسوٹا، اور جس شدت کے ساتھ لوٹا، اس کی خبریں آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوں گی اور وہ خاتون جنہوں نے بڑا اعتراض کیا تھا کہ کیوں میری فوٹو کھینچی گئی ہے۔ کیا ہوگیا اگر میں نے 10-15 کروڑ نکال لیا ہے تو؟

تو یہ دردناک کہانی بھی ساتھ لے کر چلنی پڑتی ہے۔ ایک بات البتہ 14 اگست کے رشتے کے حوالے سے ہے۔ کافی دیر کی بات ہے۔ کبھی کبھی مجھ سے ایسی باتیں سرزد ہوگئی ہیں، اور اب بھی ہوتی ہیں۔ وہ یہ کہ میری بڑی آرزو تھی کہ کبھی کوئی 14 اگست ایسا بھی

منایا جائے جس میں اِن شیر بہادروں اور ان Creative Persons کو جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی، اس کی تعمیر کی ان کو بھی آگے لایا جائے اور آگے بٹھایا جائے۔ یہ ایک میری بڑی آرزو تھی۔ جب بھی تھی، اور اب بھی ہے۔ یہ آرزو، اور یہ تمنا، اور یہ خواہش لے کر میں وقت کے President کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے خوشی، اور فخر ہے کہ انہوں نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔ بڑی مہربانی فرمائی یہ ہمارے جنرل ضیاء الحق صاحب تھے میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔ میں نے کہا کہ سر اس مرتبہ جب ہم 14 اگست منائیں تو کچھ اس طرح سے ہو کہ جہاں آپ جھنڈا چڑھاتے ہیں، اور عمائدینِ ملک، اور غیر ملکوں کے سفیر، اور وزراء، اور نمائندے اکٹھے ہوتے ہیں، وہاں پر ایک Sitting Arrangement کچھ اس طرح کا بھی ہو کہ کرسیوں کے اس Lay Out میں اب کی بار اول قطار جو کرسیوں کی ہو، وہ ان متقی لوگوں کی ہو جو مال و دولت کے اعتبار سے یا نام ونمود کے اعتبار سے جانے، اور پہچانے نہیں جاتے، لیکن ان متقی لوگوں کو دین، اور قرآن کی پروا ہے۔ دین، اور قرآن کہتا ہے کہ "تم میں کوئی بڑا نہیں، تم میں کوئی Superior نہیں، ماسوائے اس کے کہ جو تقویٰ رکھتا ہو۔" تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم 22 کرسیاں آگے لگائیں، اور 22 تقویٰ والے لوگ ہوں۔ سفید دودھیا چادروں والے۔ چھوٹی چھوٹی ان کی پگڑیاں ہوتی ہیں، وہ باندھ کر وہ تشریف فرما ہوں، اور ان کے بعد غیر ملکی سفیر، اور باہر کے نمائندوں کی ہوں۔ اس کے بعد پھر کوئی، اور تاجر وغیرہ، اور ہم جو آرٹسٹ لوگ خوامخواہ زبانی باتیں کرنے والے ہیں، ہم سب سے آخر میں ہوں، اور ہم سے بھی آخر میں بیوروکریٹس ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ تو وہ کہنے لگے کہ اشفاق صاحب میری



بھی یہی آرزو ہے۔ آپ بہت اچھی **Suggestion** لے کر آئے ہیں۔ لیکن تقویٰ والے لوگ ہم کہاں سے لیں۔ تو میں نے کہا کہ سر تقویٰ والے لوگ تو ہمارے اردگرد بہت سے ہیں۔ آپ کے اس محل میں بہت سارے مالی ایسے ہیں۔ بہت سارے بابے ایسے ہیں ۔ بہت کمال کے پیارے لوگ ایسے ہیں جن کی وجہ سے میرے پیارے ملک کی بنیادیں استوار بھی ہیں، اور پائیدار بھی ہیں۔ وہ سب دُعا دینے والے لوگ ہیں۔

آج سے کوئی پانچ چھ دن پہلے میں لاہور کے میو ہاسپٹل میں گیا۔ مجھے کوئی ضرورت تھی۔ وہاں مجھے رکنا پڑا تو اس کے کینسر کے وارڈ میں ایک گاؤں کی اچھی سی جسے انگریزی میں **Well Meaning** کہتے ہیں، اچھے سبھاؤ والی، پیاری سی شکل کی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں آئی ہو یہاں بی بی؟ وہ کہنے لگی، مجھے کینسر کی شکایت ہے، اور مجھے یہاں تھیراپی کے لیے آنا پڑتا ہے۔ کہنے لگی کہ بھاجی یہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔ جس سے میں گزر رہی ہوں لیکن میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں، اور جب میں سویرے سب سے پہلے اٹھتی ہوں تو میں نماز پڑھنے کے بعد دُعا میں سب سے پہلے اس دنیا کے بندوں کے لیے دُعا کرتی ہوں کہ یا اللہ کُل عالم کی خیر ہو۔ ہماری نانیاں، دادیاں اکثر یہی دُعا مانگا کرتی تھیں کہ کُل عالم کی خیر ہو۔ اللہ ان سب کا بھلا کرے۔ اور پھر میں کہتی ہوں کہ یا اللہ، میرے پاکستان کی خیر ہو، اور اس کے بعد میں کہتی ہوں کہ یا اللہ حکمرانوں کی خیر ہو۔ تو میں نے ایک اچھے جرنلسٹ کی طرح کہا، حکمرانوں کی خیر کیوں ہو؟ وہ تو بڑے خراب ہوتے ہیں۔ کہنے لگی، بھاجی اگر حکمران ہوں گے۔ جیسے تیسے بھی ہوں، تبھی گاڑی آگے چلے گی نا۔ اللہ ان کی بھی خیر کرے، اور جہاں جہاں ان کی کمیاں ہیں، ان کو بھی اللہ

پورا کرے۔ میں ان کے لیے ضرور دعائیں مانگتی ہوں، تو ایسے ایسے بندے بھی موجود ہیں۔ ہاں اگر وہاں کرسیاں رکھی جائیں تو میں ان بی بی کو بھی ضرور تشریف لانے کے لیے کہتا، تو یہ آرزو تھی کہ یہ کرسیاں ہوتیں تقویٰ کی بھی۔ تو اللہ نے ہی تعریف کی ہے، اور اللہ نے ہی اس کو پسند فرمایا ہے۔ تو جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ان لوگوں کو آگے لانا چاہیے لیکن اشفاق صاحب یہ Tradition نہیں رہی۔ یہ رسم نہیں رہی۔ ہم کیا کریں، اور کیسے کریں۔ آپ مل کر ہمارے ساتھ کام کریں۔ میں نے کہا کہ جی میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ تو ہم نے یعنی میں نے، اور مرحوم نے بھی (اللہ ان کے درجات بلند کرے) اپنے طور پر زور لگایا۔ یہ سوال پیش کیا، لیکن وہ جو بڑے لوگ ہوتے ہیں نا، انہوں نے کہا کہ سر آپ کیا فضول سی بات کرتے ہیں۔ یہ تو طے شدہ ہے۔ پلان سارا تیار ہو گیا ہے اس کے چارٹ بن گئے ہیں۔

یہ لوگ جو آپ کے اردگرد موجود ہیں، اور جن سے آپ لوگ استفادہ کر رہے ہیں، لیکن آپ کو علم نہیں ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی ذات سے، اپنے علم سے اپنی تعلیم سے اپنی خوبصورتی سے اپنی پاور سے اس ملک کو فائدہ پہنچا رہے ہیں نہیں۔ وہ لوگ جو خاموش رہ کر کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو آپ کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دعائیں دیتے ہیں، اور دعائیں سمیٹتے ہوئے آپ کے اردگرد چکر کاٹتے رہتے ہیں وہ لوگ، وہ تقویٰ والے ہیں جن متقی لوگوں سے ہم واقف نہیں ہیں اور جن سے ہم واقفیت حاصل کرنا بھی نہیں چاہتے۔ تو میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ جب تک گھر سے دانا دانا لا کر بکھیرا نہیں جائے گا، واپس نہیں ملے گا۔



پیارے لوگو! ہم سندھ کے مشہور Desert تھر پارکر میں تھے، اور کافی دور نکل گئے تھے۔ صحرا کو تو آپ جانتے ہیں کہ جب وہاں کوئی آدمی پھنس جائے تو بڑی پیاس لگتی ہے۔ ننگر پارکر ایک جگہ ہے۔ اس کے بعد انڈیا کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے رن کچھ ہے دلدلی قسم کی جگہ ہے تو ہم راستہ بھول گئے۔ میں اور ممتاز مفتی۔ ہم کافی عمر کے تھے، مگر جو ہمارا گروپ تھا وہ Younger تھا۔ اب پیاس بڑی شدت کی لگی، اور خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ شاید Desert کے اس کارنر میں کوئی پانی بھی ایسا نہ ملے گا جو کہ پینے کے قابل ہو۔ دلدلی علاقہ تھا۔ چل تو ہم رہے تھے، اور مشکل بھی ہمارے ساتھ تھی، اور علاقہ بھی ایسا تھا جو کہ نہایت نامانوس تھا۔ وہاں ایک بڑا سا درخت تھا۔ ایک بڑی عجیب قسم کا درخت، جو شاید صحرا کے اس دلدلی علاقے میں ہی ہو سکتا تھا، اور اس علاقے کی سرحد کے قریب ہی سرخ رنگ کے پہاڑ تھے۔ وہ پہاڑ جن سے ہماری بادشاہی مسجد بنی ہوئی ہے۔ عجیب جگہ تھی۔ ہم خوفزدہ بھی تھے۔ تو جب ہم نیچے پہنچے تو آپ سن کر حیران ہوں گے کہ وہاں ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا تو میں نے کہا کہ ممتاز یہ تو پانی ہے۔ یہ اللہ نے ہی ایسا لگایا ہے۔ اس نے کہا کہ کہیں یہ پانی زہریلا نہ ہو۔ خیر وہیں پر ایک پرانی وضع کی مٹکی سی بھی تھی مٹی کی، اور اس پر بہت ساری کائی جمی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں دھاگا ڈال کر ایک کارڈ سا بھی لٹک رہا تھا جس پر سندھی، اور اُردو میں ایک عبارت تحریر تھی کہ خبردار! اس مٹکی کا پانی نہ پینا۔ سب سے پہلے آپ اس مٹکی کو اٹھا کر اس کے پانی کو نلکے میں ڈالیں اور جب وہ پورا بھر جائے تو پھر آپ ہینڈل چلائیں اور پانی پی لیں۔ چنانچہ ہم نے مٹکی اٹھائی۔ پانی اس میں ڈالا ہینڈل چلایا اور پانی فٹافٹ چلنے لگا۔ اور ہم سب نے پیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آخری



Instruction تھی ۔" یاد رکھیے ! جاتے وقت اس مٹکی کو پانی سے بھر کر رکھ کر جائیں۔اگر آپ نے پانی لیا ہے تو آپ کو پانی دینا بھی پڑے گا اور رکھنا بھی پڑے گا، ورنہ یہ ہمیشہ کے لیے سوکھ جائے گا اور وہ لوگ جو اس علاقے میں آئیں گے وہ ٹھنڈے پانی سے محروم ہو جائیں گے۔" الحمدالله !اس مٹکی کے حوالے سے ایک بات مجھے معلوم ہوئی جو آج مجھے بڑی دیر کے بعد یاد آئی۔آپ کے سامنے عرض کر دی۔اللہ آپ کو بہت ہی آسانیاں دے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف بھی عطا کرے، اور وہ مٹکی آپ کے ساتھ جائے۔ ہر وقت اور ہر گھڑی جس میں سے ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔اللہ حافظ۔

موضوع

خدا کس کی سنتا ہے!

منظر: اشفاق صاحب نے گہرے کلر کا کرتا، شلوار زیب تن کر رکھا ہے اور ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے ہیں۔

مہمان: شہزاد احمد (شاعر)، عطاء الحق قاسمی (کالم نگار)، پروین عاطف (افسانہ نگار)، نیلم احمد بشیر (افسانہ نگار) ڈاکٹر توفیق اور عاصم قادری۔

خدا کس کی سنتا ہے!

ہم اہلِ ''زاویہ'' کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ابھی تھوڑی پہلے جب ہم میز کے گرد جمع ہو رہے تھے تو ہم دریاؤں، پانیوں اور بادلوں کی باتیں کر رہے تھے اور ہمارے وجود کا سارا اندرونی حصہ جو تھا وہ پانیوں میں بھیگا ہوا تھا اور ہم اپنے اپنے طور پر دریاؤں کے منبعے ذہنی طور پر تلاش کر رہے تھے کیونکہ زیادہ باہر نکلنا تو ہمیں نصیب نہیں ہوتا۔ جغرافیے کی کتابوں یا رسالوں جریدوں کے ذریعے ہم باہر کی دنیا بارے معلوم کرنا چاہتے ہیں اور معلوم کر بھی لیتے ہیں۔ دریاؤں کی باتیں جب ہو رہی تھیں تو میں سوچ رہا تھا کہ دریا بھی عجیب و غریب چیز ہیں اور ان کو کیسے پتہ



چل جاتا ہے نہ ان کا کوئی نروس سسٹم ہے نہ دماغ ہے پھر کس طرح سے دریا کو پتہ چل جاتا ہے کہ سمندر کس طرف ہے اور اسے ایک دن جا کے ملنا ہے بغیر کسی نقشے کے۔ دریا بغیر کسی سے پوچھے سمندر کی طرف رواں دواں ہے اور کہیں اگر اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں تو وہ دونوں چکر کاٹ کے مل کے پھر سمندر ہی کی طرف محوِ سفر رہتے ہیں اور بدقسمتی سے اگر دریا کی کوئی شاخ کسی ایسے مقام پر رک جاتی ہے جہاں بہت ہی سنگلاخ چٹان ہو اور وہ شاخ اس سے سر ٹکراتی ہے اور وہاں سر پھوڑتی ہے کہ مجھے مت روکو مجھے جانے دو اور سنگلاخ چٹان اسے کہتی ہے کہ میں تو سوا کروڑ سال سے یہاں کھڑی ہوں میں کیسے ایک طرف کو ہٹ جاؤں۔ وہ بھی دریا کی شاخ ضدی ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تو مجھے نہیں گزرنے دے گی تو میں بھی یہاں کھڑی ہوں چنانچہ دریا کے اس پانی کے ساتھ جو اس سنگلاخ چٹان کے ساتھ ٹکرا کے رُک جاتا ہے کیڑے پڑ جاتے ہیں وہاں، بھینسیں آ جاتی ہیں گوبر جمع ہونے لگتا ہے۔ بدبودار اور متعفن پانی گزرتا ہے اور اس کا وہ حصہ جو سفر پر رواں دواں تھا اور ایسی سنگلاخ چٹان آنے پر راستہ چھوڑ کے دوسری طرف سے گزر جاتا ہے وہ دریا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے بالکل اسی طرح سے انسانی زندگی ہے جہاں انسان ضد میں آ کر رُکتا ہے لڑائی جھگڑا کرتا ہے تو پھر اس کے آگے بڑھنے اور منزل تک پہنچنے کے جو بھی مقامات ہیں وہ مسدود ہو جاتے ہیں۔ آج سے بہت عرصہ پہلے میرے خیال میں سوڈیڑھ سو برس قبل کی بات ہے لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ سندیلہ ہے وہاں کے لڈو اور شاعر مشہور ہیں۔

وہ شاعر بڑے اعلیٰ پائے کے ہیں۔ لکھنؤ میں بھی بڑے شاعر تھے لیکن سندیلے کے شاعر اصلاح دیتے تھے اور اس کی اُجرت وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ سندیلے میں بہت زبردست Drought یعنی خشک سالی ہوگئی اور وہاں کے نواب اور چھوٹی چھوٹی راج دھانیاں تمام کی تمام سوکھے کا شکار ہوگئیں۔ اس قدر صورتحال خراب ہوئی کہ زمین کا کلیجہ خشکی سے پھٹنے لگا۔ جگہ جگہ پر پھٹی ہوئی زمین کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈھور ڈنگر، مویشی مرنے لگے اور ان کے بڑے بڑے پنجر اور سینگ جگہ جگہ پڑے نظر آتے۔ پرندوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ گئے تو پھر لوٹ کے نہیں آئے لوگوں نے آ کر مکھیا کے پاس شکایت کی۔ وہ مکھیا لڑکھڑاتا نواب کے پاس گیا کہ حضور لوگ گاؤں چھوڑ کر جانا چاہ رہے لہٰذا نمازِ استسقاء پڑھی جانی چاہیے کیونکہ اس طرح تو گاؤں ہی خالی ہوجائے گا۔ چنانچہ نمازِ استسقاء ادا کی گئی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا جس سے لوگوں کی مایوسیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہم اپنا ناقوس بجا کر اور بھجن گا کر بھگوان کو راضی کرتے ہیں شاید وہ بارش بھیج دے۔ انہوں نے اپنا پورا زور لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ جب ڈھور ڈنگروں کے بعد انسان بھی مرنے لگے تو اس علاقے کی طوائفیں وہ سارے اُتر پردیش میں بہت مشہور تھیں اپنا چھوٹا سا گروہ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ جناب، عوام پر بہت کڑا اور برا وقت آیا ہے اور اس برے وقت سے ہم سب ماؤف ہوگئے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ایک بات آتی ہے اگر ہمیں اس کی اجازت دی جائے تو ہم شاید اس



علاقے اور آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی ہے طوائفوں نے کہا کہ ہم بھی ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر کھلے میدان میں جا کر بیٹھیں گی اور ہم بھی کچھ گریہ وزاری کریں گی لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی آدمی اس طرف نہ آنے پائے۔ اُن کی وہ شرط منظور کر لی گئی۔ وہ اپنے قیمتی گھروں اور سونے چاندی کے زیورات اور جو بھی کچھ ان کے پاس تھا اپنے بالا خانوں پر چھوڑ کر سیڑھیاں اُتریں۔ انہوں نے سفید رنگ کی نیلی کنی والی دھوتیاں باندھی ہوئی تھیں، جیسے کلکتے والی خواتین پہنتی ہیں۔ خاص طور پر جس طرح مدر ٹریسا پہنتی تھیں۔ ایک چرواہے نے یہ آنکھوں دیکھا حال بتایا تھا حالانکہ کسی مرد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جب اس مخصوص جگہ پر آئیں تو انہوں نے گڑگڑا کر اللہ سے درخواست کی اے خدا تو جانتا ہے ہمارے افعال کیسے ہیں اور کردار کیسا ہے اور ہم کس نوعیت کی عورتیں ہیں۔ تو نے ہمیں بڑا برداشت کیا ہے۔ ہم تیری شکر گزار ہیں لیکن یہ ساری مصیبت جو انسانیت پر پڑی ہے یہ ہماری ہی وجہ سے ہے۔ اس علاقے میں جو خشک سالی آئی ہے وہ ہماری موجودگی سے آئی ہے اور اس ساری خشک سالی کا کارن ہم ہیں۔ ہم تیرے آگے سجدہ ریز ہو کر دل سے دُعا کرتی ہیں کہ بارش برسا اور اُن لوگوں اور جانوروں کو پانی عطا کرتا کہ اس بستی پر رحم ہو اور ہجرت کر کے جانے والے پرندوں کو واپس آنے کا پھر موقع ملے اور وہ یہاں خوشی کے نغمے گائیں۔ چرواہا کہتا ہے کہ جب انہوں نے سجدے سے سر اُٹھایا تو اتنی گھر کے سیاہ گھٹا آئی اور وہ چشمِ زدن میں بارش میں

تبدیل ہوگئی اور ایسی زبردست موسلا دھار بارش ہوئی کہ سب جل تھل ہوگیا اور وہ عورتیں اس بارش میں بھیگیں اور اُن کی بغلوں میں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں جنہیں لے کر وہ ایک طرف کو نکل گئیں۔ پھر کسی نے نہ اُن کا پوچھا اور نہ ہی اُن کا کوئی پتہ چلا کہ وہ کہاں سے آئیں تھیں اور کدھر چلی گئیں۔ انہیں زمین چاٹ گئی یا آسمان کھا گیا لیکن ساری بستی پھر سے ہری بھری ہوگئی۔ اُن طوائفوں کے گھروں کے دروازے کھلے تھے لوگوں نے ایک دو ماہ تو خود پر جبر کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کا قیمتی سامان چرانا شروع کر دیا اور تاریخ دان کہتے ہیں کہ ان کے گھروں سے بڑی دیر تک ایسی قیمتی چیزیں برآمد ہوتی رہیں اور اناڑی چور اور پکے چور کئی سال تک وہاں سے چیزیں لاتے رہے۔ ان کی یہ Sacrifice ان کی یہ قربانی اور لوگوں کے ساتھ محبت اور تال میل اور گہری وابستگی کو جب میں آج کے تناظر میں دیکھتا ہوں اور آج میں اپنا اخبار پڑھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ ہم جو پڑھے لکھے لوگ ہیں جو اُن طوائفوں سے بہت آگے نکل کر پانی پر جھگڑا کرتے ہیں کہ اس صوبے نے میرے اتنے قطرے پانی کے چھین لیے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے تجھے اتنے قطرے زیادہ دے دیئے۔ ان بیبیوں جیسی بلکہ بازاری بیبیوں جیسی کام کی بات نہیں کرتا اور ایسی کوئی بات کسی کے دل میں نہیں آتی اور کوئی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ پانی جو اللہ کی عطا ہے اور جو ہم کو جس قدر بھی مل رہا ہے اس کو بانٹ کے کس طرح استعمال کرنا ہے۔ جب بھی ایسی خبریں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں اور دل



میں اُن طوائفوں سے منسوب، اس کہانی کا پس منظر آ جاتا ہے تو میں اپنے اردگرد کے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم جو بہت اچھے بھلے اور پاکیزہ لوگ ہیں ان طوائفوں کی قربانی کے جذبے کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں تو مجھے ہر طرف سے چہروں پر نفی کے آثار ملتے ہیں کہ نہیں ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ہم کیسے اس Source کو ڈھونڈ سکیں اور پانی کے اس منبعے تک پہنچ سکیں جو ہماری روحوں کی آبیاری کرے لیکن یہ ہو نہیں پاتا۔ اس کی طرف ہم جا نہیں سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ میرے پیارے مہمانوں (حاضرین ''زاویہ'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں سے کوئی مجھے تھوڑی سی Guidence اس حوالے سے عطا کرے کہ کس طرح سے ہم اس منزل تک پہنچ سکیں جس منزل پر وہ پاکیزہ بیبیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

(پروگرام میں سوال و جواب کا سیشن شروع ہوتا ہے)

اشفاق احمد صاحب سوال کرتے ہیں: ''شہزاد صاحب! وہ بیبیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں اس حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟''

شہزاد صاحب: ''آپ نے یہ جو سوال اٹھایا ہے یہ آپ کے لیے بھی بہت مشکل سوال ہے اور ہم سب کے لیے بھی مشکل ہے۔ اصل میں جو کہانی آپ نے بیان کی اس کے جو معانی میرے ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم سب اپنے اپنے گناہوں اور اعمال کی ذمہ داری قبول کریں اور پھر اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی ہی اصلاح کریں بلکہ کسی بہت بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جائیں

اور یہ گلہ نہ کریں کہ کس کو کتنا پانی ملا اور کس کو کتنا پانی نہیں ملا۔اس سے ایک ایسی بارش ہوسکتی ہے جو ہم سب کو سیراب کردے۔''

اشفاق احمد صاحب: ''ہماری اس محفل میں ڈاکٹر توفیق صاحب بھی موجود ہیں۔ان کے پاس بھی بڑے مریض آتے ہیں اور یہ بڑے نیکی کے کام کرتے ہیں۔ ان سے بھی پوچھا جائے کہ ہم میں کس طرح سے وہ جذبہ پیدا ہو جو آپ میں ہے کیونکہ میں نے آپ کو لگن اور محبت سے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ اس کے برعکس ہم رُکتے اور گھٹتے ہیں۔ہم بھی پھیلنا چاہتے ہیں۔''

ڈاکٹر توفیق: ''میرا خیال ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں اور ایک دوسرے سے جو توقعات ہم رکھ رہے ہیں ان توقعات کا دائرہ بھی جانچیں اور ایک دوسرے کو چیزیں دینے کی ہمت بھی رکھیں۔صرف لینے پر ہی مصر نہ رہیں۔جب یہ سارے جذبے ہم میں آجائیں گے تو ہم مل بیٹھ کے پانی کے قطروں کو جو بھی ہمارے پاس ہیں،اُن کو خوش اسلوبی سے بانٹ لیں۔''

اشفاق احمد: ''پروین اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

بیگم پروین عاطف صاحبہ: ''میں سمجھتی ہوں کہ میرا جو اپنا زاویہ نظر ہے وہ یہ ہے کہ جیسے توفیق صاحب نے فرمایا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں گے تو ہم قطرے بانٹیں گے مجھے یہ نہیں لگتا کہ میں اور آپ اس میں قصوروار ہیں یا کہ ہم لوگ اپنی سطح پر غلطی پر ہیں۔ہمیں ان عناصر کے مذموم مفادات کو پن پوائنٹ کرنا ہوگا جو اپنے ذاتی



اغراض ومقاصداورفوائد کے لیے اس طرح کی بانٹ یااس طرح کی بندر بانٹ ہم کو سکھاتے ہیں۔اگرہم میں حُب الوطنی کا جذبہ بیدار ہوجائے اور ہم سمجھیں کہ اتفاق اور محبت سے ہی مسائل حل کر سکتے ہیں۔وہ بیبیاں جن کی مثال دی گئی ہے وہ متحد ہو کر جنگل میں گئی تھیں۔اوراُن کے دل میں دردتھااورانہوں نے اپناذاتی فائدہ چھوڑ دیا تھا تب وہ مسئلہ حل ہوا تھا۔ہمارے اوپر جوبھی مسائل آ رہے ہیں وہ پانی کے ہوں یااناج کےاس میں **Vasted Interest** کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔‘‘

اشفاق احمد:’’چونکہ پانی کی باتیں ہورہی ہیں اور ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ گلیشیر پگھلا کر اپنے آئندہ مصارف کے لیے پانی حاصل کریں گےتو مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ہم ناران جارہے تھےاورہمیں یہ کہہ کرروک دیا کہ گلیشیر کی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔آپ کوایک دودن یہاں بالاکوٹ میں قیام کرنا پڑے گا۔بالاکوٹ میں تب ایسا کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ہمارے ساتھ ممتاز مفتی صاحب بھی تھے۔وہ کہنے لگے یار ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ مسافر مسجد میں وقت گزارتے تھےتو چلو کسی مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں۔ہم پانچ آدمی تھے مولوی صاحب کے پاس گئے ان سے کہا کہ آپ کیا ہمیں مسجد میں رہنے کی اجازت دیں گے۔انہوں نے کہا کہ ہاں جی کیوں نہیں۔ادھر برآمدہ ہے،صف ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایسی کوئی دری نہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا۔ہم نے کہا کہ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے پاس **Sleeping Bages** ہیں۔مولوی صاحب بھی وہ سلیپنگ بیگ

دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ یہ بڑی مزیدار چیز ہے کہ اس کے اندر آدمی گھس جائے اور سکون سے سو جائے۔ ہم ایک دو دن وہاں ویسے ہی سوتے رہے۔ ابھی ہمیں آگے جانے کی کلئیرنس نہیں مل رہی تھی۔ وہ مولوی صاحب بھی عجیب وغریب آدمی تھے ان کے گھر کے دو حجرے تھے۔ ہم سے کہنے لگے۔ممتاز مفتی اُن کے بڑے دوست ہو گئے۔ میرے ساتھ چائے پئیں وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور جس کمرے میں ہمیں بٹھایا اس میں ایک صندوقچی تھی بیٹھ کر وہ جس پر لکھتے تھے اور باقی صف بچھی ہوئی تھی۔ ممتاز مفتی تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگے کہ مولوی صاحب! آپ کا سامان کہاں ہے تو وہ کہنے لگے آپ ہم کو بتاؤ کہ آپ کا سامان کدھر ہے؟ ممتاز مفتی کہنے لگے میں تو مسافر ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا میں بھی تو مسافر ہوں۔ کیا جواب تھا۔ اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا ایک خادم تھا وہ اَذان دیتا تھا۔ اس نے واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اندر آ کے کبھی ایک اور کبھی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا۔ میں سمجھا کہ اسے کوئی خارش کا مرض لاحق ہوگا یا ایک ''جھولے'' کا مرض ہو جاتا ہے اسے وہ ہوگا۔ وہ بار بار جیب دیکھتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا تجسس پیدا ہوا۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ کا یہ خادم کیا بیمار ہے۔ کہنے لگے نہیں اللہ کے فضل سے بہت صحت مند بہت اچھا اور نیک آدمی ہے۔ میں نے کہا جی یہ ہر وقت جیب میں ہاتھ ڈال کے کچھ ٹٹولتا رہتا ہے۔ کہنے لگے جی یہ اللہ والا آدمی ہے اور خدا کے اصل بندے جو ہیں وہ ہر وقت جیبوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں کہ اس میں کوئی چیز تو نہیں پڑی جو اللہ کو



ناپسند ہو۔ میں نے کہا کہ ہم تو بڑے بدنصیب ہیں اور اس شہر سے آتے ہیں جہاں ناپسند چیزیں ہم جیبوں میں ہی نہیں دل کے اندر تک بھرتے ہیں اور بہت خوش بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے آدمی یا کردار جب پیدا ہونے لگیں گے تو پھر ظاہر ہے کہ کچھ مشکلات دور ہوں گی اور یہ کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے اور ایک دوسرے کو جاننے کے لیے ہمیں شاید وقت درکار ہو یا ہمیں اپنے اردگرد کے لوگ ویسے نہ نظر آتے ہوں جیسے نظر آنے چاہئیں یا وہ Level ہم نے Create ہی نہ کیا ہو جو بڑے مہذب ملکوں نے کیا ہوا ہے یا جو ہمارے سامنے اور دیکھتے دیکھتے چائنا نے Create کر لیا ہے۔ ہمارے چودہ کروڑ عوام ایک طرف ہیں اور ہم جو مراعات یافتہ لوگ ہیں ہم نے انہیں خود سے الگ کیا ہوا ہے۔ ہمارے اور اُن کے درمیان ایک بہت بڑی گہری کھائی ہے جو کبھی تو پانی سے بھر جاتی ہے اور کبھی سوکھ جاتی ہے اور پانی سے خالی ہو جاتی ہے۔ اب اس مکالمے میں ہم عطاء الحق قاسمی سے پوچھتے ہیں کہ ہم وہ کونسا راستہ پکڑیں جس میں ہم لوگوں کو آسانیاں عطا فرمائیں اور یہ معاشرتی مسائل جو پیدا ہوتے ہیں یہ پیدا نہ ہوں۔"

عطاء الحق قاسمی: "اشفاق صاحب! آپ نے جو حقائق بیان کیے ہیں اور جو حکایت بیان کی ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے اور اس میں اتنے معانی پوشیدہ ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں آپ ہی کی بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم 14 کروڑ عوام سب بہت اچھے ہیں۔ ہم میں سے کچھ کو چاہیے

کر اپنے آپ کو برا سمجھیں اور جا کر ان ہی بازاری عورتوں کی طرح گریہ زاری کریں تب شاید ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔"

اشفاق احمد: "عاصم قادری صاحب! آپ بھی کچھ فرمائیں۔"

عاصم قادری: "لوگ ایثار و قربانی کی شیئرنگ اور مل بانٹنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم لوگ ہر گھنٹہ ہر منٹ ایک ایسی بے یقینی اور غربت کی طرف چلتے چلے جا رہے ہیں جہاں پر سوچ کی Maturity ہم سے بہت دور ہے اور ہم میں چھین کے کھا لینے کی حس بیدار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آپ اس مسئلے کو جو مسئلہ ہر دن ہمیں غربت اور بے یقینی کی جانب گھسیٹتا چلا جا رہا ہے اس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔"

اشفاق احمد: "ہمارے درمیان نیلم احمد بشیر تشریف رکھتی ہیں۔ وہ اس عہد کی بہت معتبر نوجوان افسانہ نگار اور قلم کار ہیں اس سلسلے میں جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اس کی بابت اُن سے پوچھتے ہیں۔"

نیلم احمد بشیر: "اشفاق صاحب کی بیان کردہ حکایت سے دو باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ جن خواتین کا انہوں نے تذکرہ کیا انہیں معاشرتی طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن پھر بھی ان کے دل میں ایک مقصد تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خدا سے دُعا کی اور وہ ایک عظیم تر مقصد تھا۔ دوسری بات جو پانی کی ہے یہ مسئلہ روز اخباروں میں آتا ہے اور اس سے ہم کافی افسردہ بھی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم سب میں Tolerance کی کمی ہے۔ برداشت کا مادہ شاید کم ہو

گیا ہے اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی کافی کم ہے اس لیے اگر ہم میں سے کچھ قطرے کسی کو زیادہ مل جاتے ہیں یا کچھ کم تو ہم لوگ واویلا مچا دیتے ہیں جبکہ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اگر ایک صوبے کو پانی ملے گا اور دوسرے کو نہیں تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ سارے ملک کو پانی ملے گا اور فصلیں پیدا ہوں گی تو سب ہی خوشحال ہوں گے۔''

(عطاء الحق قاسمی درمیان میں بولتے ہیں)

''اشفاق صاحب اس حوالے سے ایک بہت ضروری بات میں کہنا چاہ رہا ہوں اور وہ اخباروں کے کردار کے حوالے سے ہے۔ اخبارات اس ایشو کو جس طرح اُٹھاتے ہیں میں سمجھتا ہوں وہ بالکل قومی مفاد میں نہیں ہے۔ سیکرٹریوں کی جو میٹنگز ہوتی ہیں یہ بات وہیں تک رہنی چاہیے جبکہ اس کے برعکس یوں لگتا ہے کہ جیسے دو صوبوں کی صف آراء ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف طبل جنگ بجا دیا گیا ہے۔ یہ صورتحال قطعاً قومی مفاد میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کو اپنا کردار بہت احتیاط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔''

اشفاق احمد: ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور گھوم پھر کے بات پھر اُسی مرکز پر آ جاتی ہے کہ جب تک ہم میں تعلیم کا فقدان رہے گا اور جب تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تربیت درست انداز خطوط اور سطح پر نہیں ہوگی اس وقت تک ہم ایسی الجھنوں کا شکار ہوتے رہیں گے، اور اس میں مبتلا ہوتے رہیں گے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے

کہ جو صاحبان اختیار و اقتدار ہیں اور جن کے ہاتھ اور قبضے میں لوگوں کی زندگیوں کی قدرت ہے اُن کو دوبارہ اپنے آپ کو بھی درست کرنا چاہیے اور اس تعلیم کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اس حوالے سے تربیت کی واقعی ضرورت ہے۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کیا جانا چاہیے اور میں تو اکثر ایک ہی بات کہا کرتا ہوں کہ جب تک آپ اپنے 14 کروڑ باقی بھائیوں کو اُن کی عزت نفس نہیں لوٹائیں گے آپ پوری طرح سے بٹے رہیں گے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اُن کو اُن کی عزت لوٹا دیجیے اور اُن کو سلام کیجیے۔ آپ کے گھر دانوں سے بھر جائیں گے اور آپ کی چاٹیاں مکھن سے لبریز ہو جائیں گی۔ آپ سے اجازت لوں گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔


موضوع
احساس
منظر: اشفاق صاحب نے کریم کلر کا کرتا اور سفید شلوار پہن رکھی ہے۔
اُن کے دائیں بائیں صوفے پر خواتین بیٹھی ہیں۔
مہمان: مستنصر حُسین تارڑ (کمپیئر، اداکار)

احساس

آج تک تو ہم بیشتر بابوں کے بارے میں ذکر کرتے آئے ہیں۔ آج مجھے ایک چھوٹے سے بچے کی یاد بہت ستا رہی ہے جو ایک مرتبہ اپنے ماں باپ کے بغیر، اور شاید ان سے اجازت لیے بغیر ڈیرے پر آ گیا تھا، وہ گول مٹول سا، پیارا سا بچہ تھا۔ بڑا بنا ٹھنا تھا، اور آ کے بابا جی سے روتے ہوئے کہنے لگا، کہ مجھے اپنے ابا جی سے اختلاف، شکایت ہے میں شکایت لگانے آیا ہوں۔ تو انہوں نے پوچھا، ابا جی سے ایسی کیا شکایت ہے بیٹا بیٹھو۔ کچھ لو کھاؤ پیو، مٹھائی وغیرہ رکھی تھی نا۔ تو اس نے کہا نہیں میں کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ پوچھا، شکایت کیا ہے۔ اس نے کہا یہ بھی نہیں بتاؤں گا میں۔ بس مجھے ہے۔ وہ آپ کے پاس آتے ہیں، اور وہ بڑا دعویٰ کرتے ہیں محبت کا اور شرافت کا، لیکن وہ ان میں ہے نہیں۔ السلام علیکم کہہ کر وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تو بابا جی نے کہا اس کے پیچھے جائیں اور اس کو منا کر

ا نہیں لیکن وہ بڑے غصے میں تھا، چوتھی پانچویں کا لڑکا ہوگا لیکن رُکا نہیں اور وہ چلا گیا، اور اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا اور نہ یہ پتا چلا کہ اس کے والد کون ہیں اور کس کے خلاف شکایت لے کر آیا تھا؟ لیکن وہ شکایت ہمارے ذہن کے رجسٹروں میں درج کر گیا، اور ظاہر ہے ہم اس کا کوئی قلع قمع نہ کر سکے، کیونکہ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر سے آیا ہے۔ تو میں اس کی یاد میں جو کہ بڑی دیر کے بعد آئی ہے اور اب وہ کہیں اللہ کے فضل سے بڑے عہدے پر ہوگا، یا کوئی تاجر ہوگا، یا سیاست میں داخل ہو چکا ہوگا۔ وہ اگر کہیں ہمارا پروگرام دیکھ رہا ہو تو اس کو ہمارا بہت سلام پہنچے۔

ہوا یہ کہ ہم پاکستان بنا چکے تھے، اور وہ زمانہ درمیانی مدت کا زمانہ تھا، یعنی ہمیں کچھ آدھا وقت گزر چکا تھا بیس بائیس سال۔ اور ہم لوگ competition کے میدان میں اتر چکے تھے۔ مسابقت کے میدان میں مقابلہ کے میدان میں اور ہم competition کو ہی اپنی زندگی کا معیار اور ذریعہ بنا چکے تھے۔ شرافت کا نجابت کا، آگے بڑھنے کا یہ جانتے ہوئے کہ competition جو ہے یہ تخلیقی صلاحیت کی راہ میں ایک بہت بڑا پتھر ہے۔ ایک آدمی کے اندر جو تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں نا۔ کچھ کرنے کی، کچھ کر گزرنے کی صلاحیت لیکن وہ competition میں اپنا آپ بھی بھلا چکا ہوتا ہے۔ وہ پھر ایک انسان نہیں رہتا وہ competition کی ایک مشین بن جاتا ہے اور دن رات اسی میں الجھا رہتا ہے۔ وہ ساری صلاحیتیں جو انسان میں ہوتی ہیں وہ ماؤف ہو جاتی ہیں۔ بظاہر یہ بات نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے جب بھی آپ competition کرتے ہیں وہ انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ کبھی بھی کسی پتھر کے، کھمبے کے، سٹریٹ لائٹ کے، پل کے خلاف نہیں کرتے ہیں۔ بھینس کے خلاف آپ نے کبھی competition نہیں کیا جب بھی کرتے ہیں انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ اور جب انسان کے خلاف کرتے ہیں،

اور آپ کامیاب ہو جاتے ہیں اور کامیاب ہو کر تیں بندوں کو گرا دیتے ہیں۔ تو پھر پوچھتے ہیں کہ آپ تو کامیاب ہو گئے۔ اسلام میں competition کی یہ spirit یہ صورت بالکل منع ہے۔ ایک ہی اجازت ہے اور وہ ہے تقویٰ کے لیے آپ اس میں مسابقت کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہونے میں مسابقت پیسے کمانے میں حسین بننے میں شیمپو اعلیٰ درجے کا استعمال کرنے میں، کپڑے استعمال کرنے میں، یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔ لیکن آدمی اس میں competition کرتا ہے۔ میری بچیاں کہتی ہیں کہ نہیں دادا یہ تو قمیض ہم پہن کے نہیں جائیں گی یہ تو پہلے بھی ہم پہن کے گئی تھیں سہیلی کی مہندی کے اوپر۔ یہ ہماری بے عزتی ہے۔ ایک دفعہ پہن لی، کیونکہ یہ competition ہے۔ زندگی کے جو زینی competition ہیں، وہ انسان کو بڑا تنگ کرتے ہیں۔ اور اس کی صلاحیتوں کے اوپر ایک جال ڈال دیتے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہو گا، آپ تو سمجھتے ہیں کہ competition بہت Healthy فضا میں پیدا ہوا۔ کوشش، جدو جہد، سٹرائیو Strive سٹرگل، بھاگ دوڑ یہ ساری کی ساری آپ کے اندر انا اور تکبر پیدا کرتی ہیں۔ آپ دیکھیے امریکہ کو آپ کے سامنے مثال ہے کتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے کتنا تر دد کرتا ہے کتنا competition کرتا ہے کتنا اعلیٰ درجے کا ملک ہے اور کیسا متکبر ہے۔ کسی کی کوئی بات بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کہتا ہے جو میں فیصلہ کرتا ہوں وہی ٹھیک ہے۔ جو میں نے حکم دے دیا عراق کے بارے میں وہ ٹھیک۔ تو یہ بہتر انسان ہونے کی خاصیت نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں پر حکم ہے کہ آپ competition نہیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک عجیب سی بات آپ سے کرنے لگا ہوں، آپ کے چہرے دیکھ کر۔ امید ہے آپ انشاءاللہ تعالیٰ اتنا برا نہیں مانیں گے جتنا عام لوگ مانتے ہیں۔ ایک بچہ کلاس میں فسٹ آتا ہے۔ کوئی تیں بچوں کی کلاس میں سے اب وہ تو فسٹ آ گیا اور تیں بچے جو ہیں وہ تو

وہ تو منہ کے بل گر گئے نا، زمین پر۔ اور اُن کو شرمندہ ہونے کا موقع ملا۔ تو میرا Down دین پوچھتا ہے کہ یہ بھی تو Human being ہیں یہ انسان ہیں۔ ان کا کیا بندوبست آپ نے کیا ہے۔ آپ نے تو ایک دکان بنالی، اور بڑے کمال کی چلالی۔ ایک لاکھ روپیہ روز کمانے لگے اور باقی کے بھی بندے آپ کے اردگرد رہتے ہیں۔ ان کو بھی زندہ رہنا ہے۔ یہ بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں جس طرح آپ کو حیات ملی ہے ان کو بھی زندگی ملی ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں اس کے اوپر تکبر کرنے والے کہ جناب ہم نے بہت بڑا کمال کیا۔ تو یہ بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ competition کی دنیا میں داخل ہو کر اپنی انسانی صلاحیت اور انسانی تخلیقی قوت جو ہے اُس کو دُبا دیتا ہے۔ یہ آج میں بہت عجیب بات آپ سے کر رہا ہوں، جو کہ عام طور پر نہیں کی جاتی ہے۔ اس وقت ہم تو یہی کہتے ہیں کہ competition ہمارا بہت اچھا ہے۔ تو باقی کے بندے کیا کریں؟ کیا وہ مرتے ہیں تو مریں اور یہ بات میں نے اس لیے شروع کی کہ پہلے تو یہ بڑوں میں بات تھی۔ اب یہ ہمارے گھروں میں پہنچ چکی ہے۔ اور میں نے Recently دیکھا کہ یہ بات بچوں میں بھی اُتار دی گئی ہے۔ اور بچے جو پڑھتے ہیں آپ جیسے ان کو بہت شرمندہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے شرمندہ کیا جاتا ہے کہ میں آپ کو اس کی مثال یہ دیتا ہوں کہ میرے گھرانے میں جو پڑھے لکھے لوگوں کا گھرانہ ہے۔ میں نے اپنے بہت قریبی عزیز جو میرے بچوں کی طرح مجھے عزیز ہے وہ لڑکا اپنی بہن سے یہ کہہ رہا تھا اپنے بھانجوں کے بارے میں کہ "آپا تیرے منڈے دے کنے نمبر آئے نیں۔" لڑکا بھی وہیں کھیل رہا تھا۔ اس نے کہا اس کے تو 680 نمبر ہیں۔ کہنے لگا اوہ یہ کوئی نمبر ہیں۔ پھر کہنے لگا، میرے لڑکے نے لیے ہیں اور دبا کے لیے ہیں 730۔ ٹھیک ہے۔ کہنے لگا 730 کیا آپاں نمبر ہی نمبر کر دیئے۔ گھر میں نمبر، اوپر نمبر، چوبارے میں نمبر وہ کیا سیڑھی پر نمبر ہمارے برانڈوں میں نمبر ہی نمبر۔ میرے کان

کھڑے ہوئے جب اس نے کہا نا کہ ہر جگہ نمبر ہی نمبر بکھرے ہوئے ہیں، ہمارے گھر میں۔ میں نے کہا شاید پتا نہیں یہ کیا بات کر رہا ہے پھر میں نے اِس کی بات غور سے سنی، اور میں نے محسوس کیا کسی خوفناک بیماری کا انجکشن دے کر کوئی اس بے چاری کو جو میری نواسی ہے چلا جا رہا ہے۔ تو میں نے اس کو بلایا کر کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس پر میری بھانجی بولی نانا یہ تو بڑی خوبی کی بات ہے اس نے زیادہ نمبر لیے تو آپ فخر کریں۔ میں نے کہا اس نے زیادہ نمبر لیے لیکن کسی ایسے باپ پر فخر کرنا نہیں چاہیے جو اس کی طرح سے ہذیان بکنے لگ جائے، جیسے یہ کر رہا ہے وہ بھی انسان ہے وہ تیری سگی بہن ہے اس کا بھی دل ہے اس کا بھی گھر ہے اس کا بھی بچہ ہے جیسا بچہ تجھے عزیز ہے ویسے ہی اس کو عزیز ہے۔ اس نے کہا نہیں جی اگر کوئی کمزور ہوگا تو ہم تو اسے شرمندہ کریں گے۔ کہنے لگا، دیکھیں اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کتنا فضل کیا ہے۔ میں کم از کم پانچ ہزار روز کا کماتا ہوں اور ہے کوئی ہمارے خاندان میں ایسا آدمی، وہ ایک اکیلا آدمی نہیں ہے۔ آپ اپنے اردگرد اپنے گھروں کے اندر اپنے شہر کے اندر دیکھیں۔ لوگ آپ کو مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے اور شرمندہ کرنے کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے طریقے جن کی مناہی ہے، جو ہمارے یہاں ایک حرام چیز تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا، آپ نے کبھی اَنا اور تکبر کے بارے میں سوچا ہی نہیں، آپ یہ competition کرنے والے مسابقت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ تکبر کا جو گناہ تھا وہ تو ابلیس نے کر لیا اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم تو بالکل تکبر نہیں کرتے۔ یہ تو جی کھلے میدان ہم کام کرتے ہیں۔ دوسرا بھی ہے تو میدان میں آئے۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی وجہ سے دوسرا نہیں آسکے گا تو کیا تم اس کو شرمندہ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں اللہ نے صرف یہ صلاحیت دی ہے تم اپنا موبائل ٹیلیفون لٹکا کے سارے محلے میں اس لیے چلتے ہو کہ میرے پاس موبائل ہے اگر ہے اور اس کو بیچ بیچ

استعمال کرتے ہو، تو اسے بند رکھو۔ اس کو چھپا کے رکھو کیوں اس غریب کو دکھاتے ہو جس کے پاس نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس اعلیٰ درجے کی کار ہے اور میرے پاس چھوٹی ہے تو تم مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو کہ لا کے میرے منہ کے آگے کھڑی کر دیتے ہو کہ اشفاق صاحب اپنی چھوٹی سی پدی گاڑی نہ نکال سکیں، تو مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے یہ زمین میری بھی ہے یہ ملک میرا بھی ہے اور جو نعمت آپ کو اللہ نے عطا کی ہے وہ مجھے بھی عطا کی ہے اور پھر بیوقوف لوگو تم یہ سمجھتے ہو کہ سب کچھ تمہاری کوششوں سے تمہاری جدوجہد سے تمہارے competition سے تمہاری بھاگ دوڑ سے تم کو ملا ہے؟ نہیں! یہ خدا کی عطا ہے۔ اس کا شکر یہ ادا کرو، اور جوں جوں عطا میں اضافہ ہوتا جائے، توں توں سرنگوں ہوتے جاؤ، نیچے سر جھکاتے چلے جاؤ۔ تو میں جس چھوٹے بچے کا ذکر کر رہا تھا، کوئی تقریباً ایک ہفتے کے بعد اس کا باپ ہمارے ڈیرے پر وہیں آیا، بابا جی کے پاس اور کہنے لگا، میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ برا حال، رو رہا تھا، اور چاروں طرف پولیس کو اطلاع دی ہے، اخباروں میں اشتہار دیا ہے سلائیڈیں چلائیں، ٹیلی ویژن پر اس کا اعلان کیا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا اور وہ میرا نور نظر ہے۔ اس کی ماں کی ظاہر ہے اور بھی بری حالت ہوگی۔ بابا جی نے کہا وہ تو یہاں آیا تھا۔ کہنے لگا یہاں آیا تھا؟ کہنے لگا، ہاں کچھ شکایت کرتا تھا لیکن وہ استاد کھی تھا کہ ہمارے قابو نہیں آ سکا۔ ہم نے بہت بہلانے اور پھسلانے کی کوشش کی وہ بیچ میں سے کھسک کر نکل گیا۔ اس نے کہا جی ہوا کیا کوئی خاص بات تو ہوئی نہیں ایسے ہی وہ حساس تھا اور ناراض ہو گیا بغیر سوچے سمجھے۔ بات یہ تھی کہ اس نے امتحان دیا اس میں اس کے کچھ کم نمبر تھے۔ جیسا ہوتا ہے بچوں کے ساتھ۔ تو سارے اس کو گھر میں عزیز رشتے دار موٹو کہہ کر پکارتے تھے۔ موٹو اس کا نام رکھا ہوا تھا۔ نک نیم جیسے ہمارے گھروں میں بے ہودہ چیز ہوتی ہے تو اس کو موٹو کہہ کر پکارتے تھے۔ تو وہ برداشت کرتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا پیار تھا

جیسے باپ کے ساتھ بچے کا پیار ہوتا ہے تو شام کو میں آیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے نمبر کم آئے ہیں سیکنڈ ڈویژن میں اس نے پاس کی چوتھی۔ تو میں نے اس سے کہا اوموٹو تیرے نمبر کم آئے ہیں۔ کہنے لگا، میں نے پہلی دفعہ اس کو موٹو کہا، سات سو آدمیوں کے موٹو کہنے سے وہ مائنڈ نہیں کرتا تھا، برا نہیں سمجھتا تھا لیکن صرف ایک میرے کہنے سے اس کو اللہ جانے کیا ہوا، اس نے اس کو برداشت نہیں کیا، اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ سات آٹھ دن ہو گئے ہیں ہم اس کو تلاش کرتے پھرتے ہیں پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ تو یہ نمبروں کی کمی اور اس کی تضحیک اور تذلیل۔ خدا کے واسطے میں آپ سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ انسان کی تذلیل نہ کیا کریں ہمیں اس کا حکم نہیں ہے۔ ایسے بالکل نہ کریں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پورے کا پورا ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ یہ زندگی جو لے کر آپ پیدا ہوئے ہیں یہ آپ کی محنت، کوشش، جدوجہد سے نہیں ہوئی، یہ آپ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہے، اگر آپ یہ کہیں کہ بڑی بھاگا دوڑی کی پھر میں پیدا ہوا اور میں نے بڑی کوشش کی یہ غلط ہوگا۔

سب سے بڑی نعمت تو آپ کو مفت ملی ہوئی ہے۔ یہ زندگی، اور دوسرے کو بھی ایسی ہی زندگی ملی ہے۔ اب ہم کو بھی اس بات کی بڑی فکر ہوئی۔ وہاں مشترکہ دُعا ہوئی سارے لوگ بڑے غمناک ہو گئے اور ہاتھ اُٹھا کے دُعا کی کہ اللہ اس کو صحیح وسلامت رکھے اور جہاں بھی ہے وہ واپس آئے اور یہ کوتاہی جوان صاحب سے اس باپ سے ہوئی دوبارہ نہ ہو۔ کہنے لگے آپ تو سمجھدار آدمی ہیں، سیانے آدمی ہیں یہاں آتے رہتے ہیں۔ کچھ کام کی باتیں آپ کے کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ پڑتی رہی ہوں گی۔ آپ کو تو یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا الفاظ گولیوں کے مانند ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنے سے پہلے چیمبر کو صاف کر کے استعمال کریں جس طرح آپ پستول کو صاف کرتے ہیں اور گولیوں کو ایک طرف رکھ لیتے ہیں اسی طرح آپ گفتگو کے لیے جب اپنا منہ یا دل استعمال کریں تو، یا جیسے

کون سی گولی چلانی ہے کون سی نہیں چلانی۔ آپ کے اردگرد اگر آپ کے پیارے بیٹھے ہیں خدا کے واسطے اس چیمبر کی طرف ضرور دیکھیں۔ یہ لڑکیاں بے خیالی میں کوئی باتیں کر جائیں اب یہ بڑی ہوں گی نا، تو ان کی شادیاں ہوئی ہیں تو انہوں نے اپنی وہ کیا ہوتی ہیں نندیں، اور ساسیں ان کے خلاف کیا کیا کچھ باتیں کر دیتی ہیں۔ پہلے تو چھپ کر کرتی تھیں، اب تو سیدھے منہ پر ہی کر جاتی ہیں۔ تو پھر جو ظلم ہوتا ہے ان کی ذات پر بھی اور ان بے چاری بوڑھیوں پر بھی اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم نے دُعا مانگی کہ یا اللہ تو مہربانی فرما اور وہ بہت پیارا، اور خوب صورت بچہ تھا تو اس کو واپس لا دے پھر ہمارے بابا نے یہ کہا، یا اللہ آئندہ زندگی میں اس کو نمبر بھی زیادہ ملتے رہا کریں اگر یہی بات ہے کم بخت زندگی میں تو اس کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم بہت غمناک ہوئے۔ آپ سے بھی میری یہی درخواست ہے کہ جب آپ الفاظ کا استعمال کریں تو دیکھیں یہ گولیاں ہیں جو آپ نے چیمبر میں ڈالی ہوئی ہیں اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں چلانا ہے یا نہیں چلانا ہے۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر میں محسوس کر رہا ہوں، میرے پیارے ملک میں جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے لوگ جو ہیں وہ ایک دوسرے کا مان اور ٹشن نہیں کر رہے ہیں، اور ان کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہو رہا کہ دوسرے لوگ جو ہیں ان کے اندر بھی جذبات ہیں وہ بھی کچھ ہیں۔ competition میں اور مسابقت اور مقابلے سے آپ کو روکا گیا ہے اور تقویٰ، نیکی، اچھائی کے لیے آپ کو اُبھارا گیا ہے کہ ہاں یہاں پر جتنا ایک مقابلہ ایک دوسرے کا کر سکتے ہیں کرو۔ راز اس میں یہ ہے کہ تقویٰ میں اچھائی میں نیکی میں جب آپ اپنے مدِ مخالف کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو ہمیں نیچے ہو کر دیکھنا پڑے گا جوں جوں آپ نیچے ہوں گے جتنی آپ عاجزی کریں گے جتنا آپ جھکیں گے اتنے آپ تقویٰ میں اونچے ہوں گے نا۔ جتنا تکبر کریں گے جتنا اونچائی میں جائیں گے جتنا آپ شیخی بگھاریں گے جتنا

آپ اپنے آپ کو اَنا عطا کریں گے، اتنا ہی آپ کا مسئلہ جو ہے وہ ایک مختلف ردھم اختیار کرتا چلا جائے گا۔ ہاں آپ ضرور competition کریں۔ میں competition سے منع نہیں کرتا، میرا دین competition سے منع نہیں کرتا، لیکن صرف تقویٰ کی حد تک لازم ہے اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیکی اختیار کریں۔

تقویٰ جس میں وہ competition ہو جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو وہ آپ کا طرۂ امتیاز نہیں ہونا چاہیے، کسی بھی صورت میں کسی بھی حال میں۔ آپ نے نام سنا ہوگا حضرت جنید بغدادیؒ کا۔ سب سے بڑے ہمارے صوفی، اُن سے ابتدا ہوئی جس کو کہتے ہیں مڈھ لگا لیکن وہ صوفی نہیں تھے وہ خلیفہ بغداد کے دربار میں ایک پہلوان تھے۔ ایک بہت بڑے ریسلر تھے جیسے آپ کے یہاں گاما پہلوان تھا۔ جنید بغدادی بھی مشہور تھے اتنے بڑے پہلوان کہ کوئی اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھے تھے اور خلیفہ بھی تھا وہاں ایک دبلا پتلا کمزور سا آدمی مریل سا فاقہ زدہ بے چارہ شکل وصورت کا بہت پیارا اور بہت اچھا، آیا اور خلیفہ وقت سے کہنے لگا کہ اے خلیفہ میں جنیدؒ کے ساتھ کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ تو جتنے دربار میں لوگ بیٹھے تھے، ہنس پڑے۔ کہنے لگے کیا پدی کیا پدی کا شوربہ تو شکل دیکھ اپنی اور اپنا وجود دیکھ اور تو اتنے بڑے پہلوان کے ساتھ کشتی کرے گا! اس نے کہا نہیں جناب مجھے کچھ داؤ ایسے آتے ہیں، کچھ چیزیں میں ایسی جانتا ہوں جو کہ اور پہلوان نہیں جانتے، اور ہمارے پاس کچھ خاندانی گر ہوتے ہیں تو وہ داؤ میں لگاؤں گا اور آپ کا جو اتنا بڑا نامی گرامی رستم زماں ہے یہ چاروں شانے چت ہوگا۔ حضرت جنیدؒ بھی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے اور تھوڑا سا گھبرائے بھی اللہ جانے ان کو کچھ ایسا راز آتا ہوگا، تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ چنانچہ وقت مقرر ہو گیا جگہ طے کر دی گئی اور خلیفہ وقت پر وہاں پہنچ گیا، سارے درباری اور بغداد کے سارے لوگ کہ



یہ آج کیا ہونے لگا ہے وہ بھی خم ٹھونک کے پدہ کمزور، دبلا پتلا آدمی مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا، وہ بھی آ گیا میدان میں۔ اور اصل پہلوان جو تھے وہ بھی اپنا لنگر لنگوٹ کس کے آ گئے۔ تو اس نے ہاتھ بڑھایا انہوں نے ہاتھ پکڑا، سلام کیا۔ ایک دوسرے سے ملے سلامی لینا جسے کہتے ہیں اور جب حضرت جنیدؒ بغدادی کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا پھر اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ دبلا پتلا کمزور سا آدمی جو تھا وہ اُچھل کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ اب یہ تو کوئی داؤ نہیں ہے کہ آدمی اس کے گلے میں جب لٹک گیا تو ان کے کان کے پاس منہ کر کے کہنے لگا: ''میں سید زادہ ہوں اور سات دنوں سے بھوکا ہوں میرے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں یہ ڈھونگ میں نے اس لیے رچایا ہے۔ اے جنیدؒ تا کہ میں لوگوں کو دکھا سکوں کہ میری کوئی عزت ہے۔'' جنید بغدادیؒ نے یہ سنا اور زمین پر دھڑ کر کے گرے اور اس سے ڈھے گئے۔ وہ ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، اور تالی بج گئی، دنیا حیران پریشان ہو گئی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے (جنیدؒ بغدادی) کہا کہ ٹھیک ہے اس کو ایسا داؤ آتا ہے جو دنیا میں کسی آدمی کو نہیں آتا اور اس کے سامنے چت ہو گیا ہوں، یہ واقعی طاقتور ہے۔ وہ تو جناب خلیفہ نے جو بھی کچھ انعامات اکرام خلعت وغیرہ دینی تھی دی اور حضرت جنیدؒ جو تولیہ یا جو صافہ گلے میں تھا جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں: ''اے اللہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا، لیکن تیرے ایک بندے کی عزت رکھی ہے اس کے بدلے میں مجھے بھی تو کوئی روحانی درجہ عطا فرما، جو تو اپنے بڑوں کو دیا کرتا ہے۔'' تو وہ ولی کامل ہوئے اور ان کی جو تعلیم ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو کبھی بھی ذلیل، چھوٹا، حقیر نہیں جاننا۔ جوں جوں آپ ایسا جانیں گے آپ کے درجات کم ہوتے جائیں گے۔ جوں جوں آپ حضرت جنید بغدادیؒ کا رویہ اختیار کریں گے، آپ کے درجات بلند ہوتے جائیں گے۔

ہم سے غلطی یہ ہوتی ہے، میں پھر چلتے ہوئے آخری بات کہوں، ہم سوچے سمجھے

بغیر پہلے تو کچھ بات منہ سے نکال دیتے ہیں، اور پھر اپنے تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے اس چیز کو طرۂ امتیاز بنا لیتے ہیں جو آپ کے کمال کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بچوں کے نمبر آ جانا، آپ کا خوش شکل ہونا، آپ کا چہرہ اچھا ہونا، آپ کی رنگت گوری ہونا یہ محض عطائے خداوندی ہے۔ اس کو تم اپنی تلوار بنا کر لوگوں کی گردنیں نہ اُتارتے رہو، اور خدانخواستہ اگر ایسا وقت آ گیا کہ صرف آپ ہی کی ذات اس کرۂ ارض پر رہنے لگی تو آپ یا آپ کے بچے کو یہ زندگی گزارنی بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خالی ساری ویران دنیا میں لوگوں کو آباد رہنے دیں ان کے ساتھ ہنسنے کھیلنے دو۔ ہم چلتے چلتے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بچہ مل گیا تھا پھر وہ ہمارے ڈیرے پر بھی آیا، اور پھر جب تک اس نے میٹرک کیا، جب تک وہ آتا رہا اور پھر ہم سارے اس سے معافیاں مانگتے رہے اور اس میں، میں سب کو آپ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی اس کی یاد آئے پتا نہیں وہ کہاں ہوگا، آپ بھی اس بات کی معافی مانگیں کہ اس کے باپ نے اُسے موٹو کیوں کہا تھا۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔



موضوع

مہذب زندگی

منظر: اشفاق صاحب نیلی شلوار کرتا اور واسکٹ پہنے صوفے سے ٹیک لگائے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ اردگرد چاروں طرف باغ ہے اور سورج مکھی کے پھول بھی نمایاں ہیں۔

مہمان: آغا شاہد

مہذب زندگی

انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی کو کسی چیز سے ایسی چڑ ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی خاص جواز نہیں ہوتا مگر یہ ہوتی ہے۔ اور میں اُن خاص لوگوں میں سے تھا جس کو اس بات سے بڑی چڑ تھی کہ ''دروازہ بند کردو''۔ بہت دیر کی بات ہے کئی سال پہلے کی جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو ایک انگریز ہیڈ ماسٹر سکول میں آیا۔ وہ ٹیچرز اور طلباء کی خاص تربیت کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ جب بھی اس کے کمرے میں جاؤ وہ ایک بات ہمیشہ کہتا تھا:

"Shut The Door Behind You"

پھر پلٹنا پڑتا تھا اور دروازہ بند کرنا پڑتا تھا۔

ہم دیسی آدمی تو ایسے ہیں کہ اگر دروازہ کھلا چھوڑ دیا، تو بس کھلا چھوڑ دیا۔ بند کر دیا تو بند کر دیا۔ قمیض اُتار کے چارپائی پر پھینک دی، غسل خانہ بھی ایسے ہی کپڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ کوئی قاعدہ طریقہ یا رواج ہمارے ہاں نہیں ہوتا کہ ہر کام میں اہتمام کرتے پھریں۔

یہ کہنا کہ دروازہ بند کر دیں، ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم نے اپنے طور پر کافی ٹریننگ کی اور انہوں نے بھی اس بارے کافی سکھایا لیکن یہ بات دماغ میں نہیں آئی بھئی دروازہ کیوں بند کر دیا جائے؟ رہنے دو کھلا کیا کہتا ہے آپ نے بھی اپنے بچوں، پوتوں، بھتیجوں کو دیکھا ہو گا وہ ایسا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ بہت سال پہلے جب میں باہر چلا گیا اور مجھے روم میں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا وہاں میری لینڈ لیڈی ایک درزن تھی جو سلائی کا کام کرتی تھی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ درزی کا کام بہت معمولی سا ہے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہ عزت والا کام ہے۔ اس درزن کی وہاں ایک بوتیک تھی اور وہ بہت باعزت لوگ تھے۔ میں اُن کے گھر میں رہتا تھا۔ اُن کی زبان میں درزن کو سارتہ کہتے ہیں میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوتا اس نے ہمیشہ اپنی زبان میں کہا: ''دروازہ بند کرنا ہے'' وہ چڑ جو بچپن سے میرے ساتھ چلی تھی وہ ایم اے پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی کا پروفیسر لگنے کے بعد بھی میرے ساتھ ہی رہی۔ یہ بات بار بار سنی پڑتی تھی تو بڑی تکلیف ہوتی اور پھر لوٹ کے دروازہ بند

کرنا ہمیں تو عادت ہی نہیں تھی۔ کبھی ہم آرام سے دھیمے انداز میں گروباپائی سے کمرے میں داخل ہی نہیں ہوئے کبھی ہم نے کمرے میں داخل ہوتے وقت دستک نہیں دی جیسا کہ قرآن پاک میں بڑی سختی سے حکم ہے کہ جب کسی کے ہاں جاؤ تو پہلے اس سے اجازت لو اور اگر وہ اجازت دے تو اندر آؤ ورنہ واپس چلے جاؤ۔ پتہ نہیں یہ حکم اٹھارہویں پارے میں ہے کہ انتیسویں میں کہ "اگر اتفاق سے تم نے اجازت نہ لی ہو اور پھر کسی ملنے والے کے گھر چلے جاؤ اور وہ کہہ دے کہ میں آپ سے نہیں مل سکتا تو ماتھے پر بل ڈالے بغیر واپس آ جاؤ۔"

کیا پیارا حکم ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم کہتے ہیں کہ اندر گھسا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں نہیں مل سکتا۔ ذرا باہر نکلے تو اس کو دیکھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہماری اَنا اس طرح کی ہے اور یہ کہنا کہ "دروازہ بند کر دیں" بھی عجیب سی بات لگتی ہے۔ ایک روز میں نے بار بار یہ سننے کے بعد روم میں زِچ ہو کر اپنی اس لینڈ لیڈی سے پوچھا کہ آپ اس بات پر اتنا کیوں زور دیتی ہیں۔ میں ایک بات تو سمجھتا ہوں کہ یہاں روم میں سردی بہت ہے برف باری بھی ہوتی ہے کبھی کبھی اور تیز "ویشو" رومی زبان کا لفظ مطلب ٹھنڈی ہوائیں چلنا بھی ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے دروازے سے میں بالکل شمشیر زنی کرتی ہوئی کمروں میں داخل ہوتی ہیں۔ یہاں تک تو آپ کی دروازہ بند کرنے والی فرمائش بجا ہے لیکن آپ اس بات پر بہت زیادہ زور دیتی ہیں۔ چلو اگر کبھی دروازہ کھلا رہ گیا اور اس میں سے اندر ذرا سی ہوا آ گئی

یا برف کی بوچھاڑ ہوگئی تو اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔ اس نے کہا کہ تم ایک سٹول لو اور یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ وہ مشین پر کپڑے سی رہی تھی۔ میں بیٹھ گیا وہ بولی کہ دروازہ اس لئے بند نہیں کرایا جاتا اور ہم بچپن سے بچوں کو ایسا کرنے کی ترغیب اس لئے نہیں دیتے کہ ٹھنڈی ہوا نہ آ جائے یا دروازہ کھلا رہ گیا تو کوئی جانور اندر آ جائے گا بلکہ اس کا فلسفہ بہت مختلف ہے اور یہ کہ اپنا دروازہ اپنا وجود ماضی کے اوپر بند کر دو، آپ ماضی میں سے نکل آئے ہیں اور اس جگہ پر اب حال میں داخل ہو گئے ہیں۔ ماضی سے ہر قسم کا تعلق کاٹ دو اور بھول جاؤ کہ تم نے ماضی کیسا گزارا ہے اور اب تم ایک نئے مستقبل میں داخل ہو گئے ہو۔ ایک نیا دروازہ تمہارے آگے کھلنے والا ہے اگر وہی کھلا رہے گا تو تم پلٹ کر پیچھے کی طرف ہی دیکھتے رہو گے۔ اس نے کہا کہ ہمارا سارے مغرب کا فلسفہ یہ ہے اور دروازہ بند کر دو کا مطلب لکڑی، لوہے یا پلاسٹک کا دروازہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب تمہارے وجود کے اوپر ہر وقت کھلا رہنے والا دروازہ ہے۔ اس وقت میں ان کی یہ بات نہیں سمجھ سکا جب تک میں لوٹ کے یہاں پاکستان نہیں آ گیا اور میں اپنے جن ''بابوں'' کا ذکر کیا کرتا ہوں ان سے نہیں ملنے لگا۔ میرے ''بابا'' نے مومن کی مجھے یہ تعریف بتائی کہ مومن وہ ہے جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔ کہ یا اللہ پتہ نہیں آگے چل کے کیا ہوتا ہے وہ حال میں زندہ ہو۔

آپ نے ایک اصطلاح اکثر سنی ہو گی کہ فلاں بزرگ بڑے صاحب حال

تھے۔ مطلب یہ کہ ان کا تعلق حال سے تھا وہ ماضی کی یاد اور مستقبل کی فکر کے خوف میں مبتلا نہیں تھے۔ مجھے اس لینڈ لیڈی نے بتایا کہ دروازہ بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تم ایک نئے عہد، ایک نئے دور ایک نئے Era اور ایک اور وقت اور زمانے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور ماضی پیچھے رہ گیا ہے۔ اب آپ کو اس زمانے سے فائدہ اُٹھانا ہے اور اس زمانے کے ساتھ نبرد آزمائی کرنی ہے جب میں نے یہ مطلب سنا تو چکا چوند ہو گیا کہ میں کیا ہم سارے ہی دروازہ بند کرنے کا مطلب یہی لیتے ہیں جو عام طور پر ہو یا عام اصطلاح میں لیا جاتا ہے۔ بچوں کو یہ بات شروع سے سکھانی چاہیے کہ جب تم آگے بڑھتے ہو، جب تم زندگی میں داخل ہوتے ہو کسی نئے کمرے میں جاتے ہو تو تمہارے آگے اور دروازے ہیں جو کھلنے چاہیں۔ یہ نہیں کہ تم پیچھے کی طرف دھیان کر کے بیٹھے رہو۔

جب اس نے یہ بات کہی اور میں نے سنی تو پھر میں اس پر غور کرتا رہا اور میرے ذہن میں اپنی زندگی کے واقعات، اردگرد کے لوگوں کی زندگی کے واقعات بطور خاص اُجاگر ہونے لگے اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ہم لوگوں میں سے بہت سے لوگ آپ نے ایسے دیکھے ہونگے جو ہر وقت ماضی کی فائل بلکہ ماضی کے البم بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ اکثر کے پاس تصویریں ہوتی ہیں۔ کہ بھائی جان میرے ساتھ یہ ہو گیا میں چھوٹا ہوتا تھا تو میرے ابا جی مجھے مارتے تھے سوتیلی ماں تھی فلاں فلاں وہ نکلتے ہی نہیں اس یاد ماضی سے۔ میں نے اس طرح ماضی پر رونے

دھونے والے ایک دوست سے پوچھا: ''آپ اَب کیا ہیں؟'' کہنے لگے: ''جی میں ڈپٹی کمشنر ہوں لیکن رونا یہ ہے کہ جی میرے ساتھ زمانہ بڑا ظلم کرتا رہا ہے۔'' وہ ہر وقت یہی کہانی سناتے۔ ہمارے مشرق میں ایشیا' فارس تقریباً سارے ملکوں میں یہ رواج بہت عام ہے اور ہم جب ذکر کریں گے اس دردنا کی کا ذکر کرتے رہیں گے۔
ہماری ایک آپا ہیں جو کہتی ہیں کہ میری زندگی بہت بربادی میں گزری بھائی جان میں نے بڑی مشکل سے وقت کاٹا ہے۔ اب ایک بیٹا تو ورلڈ بینک میں ملازم ہے ایک یہاں چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہے۔ ایک بیٹا سرجن ہے۔ اُنکے خاوند کی بھی اچھی تنخواہ تھی، اچھی رشوت بھی لیتے رہے انہوں نے بھی کافی کامیاب زندگی بسر کی۔
میں نے ایک بار اُن سے پوچھا تو کہنے لگے بس گزارا ہو ہی جاتا ہے وقت کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آدھی رشوت تو آپ سرکاری افسر ہونے کے ناطے دیگر سرکاری سہولتوں کی مد میں وصول کرتے ہیں مثلاً آپ کی اٹھارہ ہزار روپے تنخواہ ہو گی تو ایک کار، ایک دوسری کار، پانچ نوکر گھر یہ اللہ کے فضل سے بہت بڑی بات ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی چاہیے؟ وہ بولے: ''ہاں! اس کے علاوہ بھی ضرورت پڑتی ہے لیکن ہم نے بڑا دکھی وقت گزارا ہے مشکل میں گزارا ہمارا ماضی بہت دردناک تھا وہ ماضی کا دروازہ بند ہی نہیں کرتے۔ ہر وقت یہ دروازہ نہ صرف کھلا رکھتے ہیں بلکہ اپنے ماضی کو ساتھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔ میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے آج کے بعد آپ بھی غور فرمائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اُن کے پاس اپنے ماضی

کی رنگین البمیں ہوتی ہیں۔اُن میں فوٹو لگے ہوئے ہوتے ہیں اور دکھ درد کی کہانیاں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔اگر وہ دکھ درد کی کہانیاں بند کر دیں کسی نہ کسی طور پر تگڑے ہو جائیں اور یہ تہیہ کر لیں کہ اللہ نے اگر ایک دروازہ بند کیا تو وہ اور کھولے گا،تو یقیناً اور دروازے کھلتے جائیں گے۔ اگر آپ پلٹ کر پیچھے دیکھتے جائیں گے اور اسی دروازے میں سے جھانک کے وہی گندی مندی، گری پڑی چیزوں کو اکٹھا کرتے رہیں گے تو آگے نہیں جاسکتے ۔ اس طرح سے مجھے پتہ چلا کہ **Shut the door behind you** کا مطلب یہ نہیں ہے جو میں سمجھتا رہا ہوں۔ وہ تو اچھا ہوگیا کہ میں اتفاق سے وہاں چلا گیا ورنہ ہمارے جو انگریز استاد آئے تھے انہوں نے اس تفصیل کے ساتھ نہیں بتایا تھا۔آپ کو ہم کو سب کو یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ ماضی کا پیچھا چھوڑ دیں۔

ہمارے بابے، جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں بار بار کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا اُن کے ڈیروں پر آپ جا کر دیکھیں وہ ماضی کی بات نہیں کریں گے۔وہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ آپ یہاں آگئے ہیں یہ نئی زندگی شروع ہوگئی ہے۔آپ بالکل روشن ہوجائیے چمک جائیے۔ جب ہمارے جیسے نالائق بری ہیئت رکھنے والے آدمی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو وہ نعرہ مار کے کہتے ہیں: ''واہ! واہ! رونق ہوگئی برکت ہوگئی ہمارے ڈیرے کی کہ آپ جیسے لوگ آگئے''۔اَب آپ دیکھئے ہمارے اوپر مشکل وقت ہے لیکن سارے ہی اپنے اپنے انداز میں مستقبل سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ پتا

نہیں جی کیا ہوگا اور کیسا ہوگا؟ میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنا چاہیے۔ ہم کوئی ایسے گرے پڑے ہیں ہم کوئی ایسے مرے ہوئے ہیں ہمارا پچھلا دروازہ تو بند ہے اب تو ہم آگے کی طرف چلیں گے۔ اور ہم کبھی مایوس نہیں ہوں گے اس لیے کہ اللہ نے بھی حکم دے دیا ہے کہ مایوس نہیں ہونا اس لیے حالات مشکل ہوں گے تکلیفیں آئیں گی بہت چیخیں نکلیں گی۔ لیکن ہم مایوس نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے اللہ کا حکم ہے اور ہمارے نبیؐ کے ذریعے یہ فرمان دیا گیا ہے کہ **لا تقنطو من رحمته اللّٰه** یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔

بعض اوقات یہ پتا نہیں چلتا کہ اللہ کی رحمت کے کیا کیا رُوپ ہوتے ہیں۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میرے ساتھ یہ زیادتی ہو رہی ہے میں **Demote** ہو گیا ہوں لیکن اس **Demote** ہونے میں کیا راز ہے؟ یہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس راز کو پکڑنے کے لیے ایک ڈائریکٹ کنکشن اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے اور اس سے پوچھنا چاہیے کہ جناب! اللہ تعالیٰ میرے ساتھ یہ جو مشکل ہے میرے ساتھ یہ تنزلی کیوں ہے؟ لیکن ہمیں اتنا وقت نہیں ملتا اور ہم پریشانی میں اتنا گم ہو جاتے ہیں کہ ہمیں وقت ہی نہیں ملتا ہمارے ساتھ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمیں بازاروں میں جانے کا وقت مل جاتا ہے، تفریح کے لیے مل جاتا ہے، دوستوں سے ملنے بات کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھ بیٹھنے کا، اپنے اندر جھانکنے کا کوئی وقت میسر نہیں آتا۔

آپ ہی نہیں میں بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ اگر میں اپنی ذات سے

پوچھوں کہ ''اے اشفاق احمد صاحب! آپ کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا کتنا وقت ملتا ہے؟ کبھی آپ نے اپنا احتساب کیا ہے؟'' تو جواب ظاہر ہے کہ کیا ملے گا۔ دوسروں کا احتساب تو ہم بہت کر لیتے ہیں۔ اخباروں میں، کالموں میں، اداریوں میں، لیکن میری بھی تو ایک شخصیت ہے میں بھی تو چاہوں گا کہ میں اپنے آپ سے پوچھوں کہ ایسا کیوں ہے اگر ایسا ممکن ہو گیا تو پھر خفیہ طور پر اس کا کوئی اعلان نہیں کرنا ہے یہ بھی اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے ایک راستہ رکھا ہوا ہے توبہ کا! کئی آدمی تو کہتے ہیں کہ نفل پڑھیں ورد وظیفہ کریں لیکن یہ اس وقت تک نہیں چلے گا جب تک آپ نے اس کیے ہوئے برے کام سے توبہ نہیں کر لی۔ توبہ ضروری ہے۔ جیسا آپ کاغذ لے کے نہیں جاتے کہ ''ٹھپہ'' ہے جو لگ جاتا ہے اور بڑی آسانی سے لگ جاتا ہے اگر آپ تنہائی میں دروازہ بند کر کے بیٹھیں اور اللہ سے کہیں کہ: ''اللہ میاں پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا مجھ سے یہ غلطی گناہ ہو گیا اور میں اس پر شرمندہ ہوں۔'' میں یہ Reason نہیں دیتا کہ Human Being کمزور ہوتا ہے یہ انسانی کمزوری ہے یہ بڑی فضول بات ہے ایسی کرنی ہی نہیں چاہیے۔ بس یہ کہے کہ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی ہے اور میں اے خداوند تعالیٰ آپ سے اس کی معافی چاہتا ہوں اور میں کسی کو یہ بتا نہیں سکتا اس لیے کہ میں کمزور انسان ہوں۔ بس آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ اس طرح سے پھر زندگی کا نیا کامیاب اور شاندار راستہ چل نکلتا ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ماضی کو ہی اُٹھائے پھریں گے اس کی فائلیں ہی بغل میں لیے پھریں گے اور یہی رونا



روتے رہیں گے کہ میرے ابّا نے دوسری شادی کر لی تھی یا میرے ساتھ سختی کرتے رہے یا انہوں نے بڑے بھائی کو زیادہ دے دیا مجھے کچھ کم دے دیا چھوٹے نے زیادہ لے لیا شادی میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس طرح تو یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہو گا پھر تو آپ وہیں کھڑے رہ جائیں گے دہلیز کے اوپر اور نہ دروازہ کھولنے دیں گے نہ بند کرنے دیں گے۔ بس پھنسے ہوئے رہیں گے۔ لیکن آپ کو چاہیے کہ آپ **Shut The Door Behind You** کر کے زندگی کو آگے لے کر چلیں۔ آپ زندگی میں یہ تجربہ کر کے دیکھیں۔ ایک مرتبہ تو ضرور کریں۔ آپ میری یہ بات سننے کے بعد جو میری نہیں میری لینڈ لیڈی اس اطالوی درزن کی بات ہے اس پر عمل کر کے دیکھیں۔

اس کے بعد میں نے رونا چھوڑ دیا اور ہر ایک کے پاس جا کر رحم کی اور ہمدردی کی بھیک مانگنا چھوڑ دی۔ آدمی اپنے دُکھ کی البم دکھا کر بھیک ہی مانگتا ہے نا! جسے سن کر کہا جاتا ہے کہ بھئی! غلام محمد، یا نور محمد یا سلیم احمد تیرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔ اس طرح دو لفظ آپ کیا حاصل کر لیں گے اور سمجھیں گے کہ میں نے بہت کچھ سر کر لیا، لیکن وہ قلعہ بدستور قائم رہے گا جسے فتح کرنا ہے۔ اگر آپ تہیہ کر لیں گے کہ یہ ساری مشکلات یہ سارے بل یہ سارے یوٹیلیٹی کے خوفناک بل تو آتے ہی رہیں گے یہ تکلیف ساتھ رہے گی بچے بھی بیمار ہوں گے بیوی بھی بیمار ہو گی خاوند کو بھی تکلیف ہو گی، جسمانی عارضے بھی آئیں گے روحانی بھی نفسیاتی بھی۔ لیکن ان سب کے ہوتے

ہوئے ہم تھوڑا سا وقت نکال کر اور مغرب کا وقت اس کے لیے بڑا بہتر ہوتا ہے کیونکہ یوں تو سارے ہی وقت اللہ کے ہیں اس وقت الگ بیٹھ کر ضرور اپنی ذات کے ساتھ کچھ گفتگو کریں اور جب آپ اپنے آپ سے وہ گفتگو کر چکیں تو پھر خفیہ طور پر وہی گفتگو اپنے اللہ سے کریں، چاہے کسی بھی زبان میں۔ کیونکہ اللہ ساری زبانیں سمجھتا ہے انگریزی میں بات کریں اُردو، پنجابی، پشتو اور سندھی جس زبان میں چاہیں اس زبان میں آپ کا یقیناً اس سے رابطہ قائم ہوگا اور اس سے آدمی تقویت پکڑتا ہے بجائے اس کے آپ مجھ سے آ کر کسی بابے کا پوچھیں ایسا نہیں ہے۔ آپ خود بابے ہیں۔ آپ نے اپنی طاقت کو پہچانا ہی نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے جوگی کیا کرتے ہیں کہ ہاتھی کی طاقت سارے جانوروں سے زیادہ ہے لیکن چونکہ اس کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں اس لیے وہ اپنی طاقت وجود کو پہچانتا ہی نہیں۔ ہاتھی جانتا ہی نہیں کہ میں کتنا بڑا ہوں۔ اس طرح سے ہم سب کی آنکھیں بھی اپنے اعتبار سے چھوٹی ہیں اور ہم نے اپنی طاقت کو اپنی صلاحیت کو جانا ہی نہیں۔

اللہ میاں نے تو انسان کو بہت اعلیٰ و اَرفع بنا کر اور مسجودِ ملائک بنا کر بھیجا ہے۔ یہ باتیں یاد رکھنے کی ہیں کہ اب تک جتنی بھی مخلوق نے انسان کو سجدہ کیا تھا وہ انسان کے ساتھ ویسا ہی نباہ کر رہی ہے یعنی شجر، حجر، نباتات جمادات اور فرشتے وہ بدستور انسان کا احترام کر رہے ہیں۔ انسان سے کسی کا احترام کم ہی ہوتا ہے۔ اب جب ہم یہاں بیٹھے ہیں تو اس وقت کروڑوں ٹن برف K-2 پر پڑی آوازیں دے کر

پکار پکار کر سورج کی منتیں کر رہی ہے کہ "ذرا ادھر کرنیں زیادہ ڈالنا سندھ میں پانی نہیں ہے۔ جہلم چناب خشک ہیں اور مجھے وہاں پانی پہنچانا ہے اور نوع انسان کو پانی کی ضرورت ہے۔" برف اپنا آپ پگھلاتی ہے اور آپ کو پانی دے کر جاتی ہے۔ صبح کے وقت اگر غور سے سوئی گیس کی آوازیں سنیں اور اگر آپ اس درجے یا جگہ پر پہنچ جائیں کہ اس کی آوازیں سن سکیں تو وہ چیخ چیخ کر اپنے سے نیچے والی کو کہہ رہی ہوتی ہے "نی کڑیو! چھیتی کرو۔ باہر نکلو جلدی کرو تم تو ابھی ہار سنگھار کر رہی ہو۔ بچوں نے سکول جانا ہے۔ ماؤں کو انہیں ناشتہ دینا ہے۔ لوگوں کو دفتر جانا ہے۔ چلو اپنا آپ قربان کرو۔" وہ اپنا آپ قربان کر کے جَل بھُن کر آپ کا ناشتہ روٹیاں تیار کرواتی ہے۔

یہ سب پھل سبزیاں اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ یہ آم دیکھ لیں آج تک کسی انور رٹول یا کسی ثمر بہشت درخت نے اپنا پھل خود کھا کر یا چوس کر نہیں دیکھا۔ بس وہ تو انسانوں سے کیے وعدے کی فکر میں رہتا ہے کہ میرا پھل توڑ کر بلوچستان ضرور بھیجو وہاں لوگوں کو آم کم ملتا ہے۔ اس کا اپنے اللہ کے ساتھ رابطہ ہے اور وہ خوش ہے۔ آج تک کسی درخت نے افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ شکوہ نہیں کیا کہ ہماری بھی کوئی زندگی ہے جی جب سے کھڑے ہوتے ہیں وہیں کھڑے ہیں۔ نہ کبھی اوکاڑہ گئے نہ کبھی آگے گئے ملتان سے نکلے ہی نہیں۔ میرا پوتا کہتا ہے: "دادا! ہو سکتا ہے کہ درخت ہماری طرح ہی روتا ہو کیونکہ اس کی باتیں اخبار نہیں چھاپتا۔" میں نے کہا کہ وہ پریشان نہیں ہوتا، نہ روتا ہے۔ وہ خوش ہے اور ہوا میں جھومتا ہے۔ کہنے لگا: "آپ کو کیسے پتا ہے کہ

وہ خوش ہے؟'' میں نے کہا کہ وہ خوش ایسے ہے کہ ہم کو باقاعدگی سے پھل دیتا ہے۔ جو ناراض ہوگا تو وہ پھل نہیں دے گا۔

میں اگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھوں میں جو اشفاق احمد ہوں میں پھل نہیں دیتا۔ میرے سارے دوست میرے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ میں نہ تو انور رٹول بن سکا نہ ثمر بہشت بن سکا نہ میں سوئی گیس بن سکا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!



موضوع

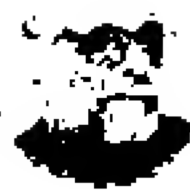
اپنے اندر کا سفر

منظر: اشفاق صاحب براؤن رنگ کا کرتا اور سفید شلوار پہنے ہوئے ہیں۔ اُن کے دائیں بائیں خواتین بیٹھی ہیں۔ سامنے کتابیں اور مٹی کا گلاس پڑا ہے اور جنگل جیسا سیاہ منظر ہے۔

مہمان: آغا شاہد (ڈائریکٹر/اداکار)، خالد احمد (شاعر)

اپنے اندر کا سفر

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے ہم ایک دن تحریر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔کوئی ہم سے پوچھ رہا تھا کہ جو تحریر ہے، اس کو آپ کس طرح سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں کہ ایک تحریر صحافت کی ہوتی ہے، اور ایک تحریر ادب کی ہوتی ہے، اور ان میں کیا فرق ہے؟ تو میں اُن سے یہی عرض کر رہا تھا کہ صحافت کی تحریر ایک وقائع نگار کی تحریر ہوتی ہے۔ وہ جو جو واقعات دیکھتا ہے، انہیں کے ساتھ کو دیکھ پرکھ کر ایک فریم ورک میں موجود کر کے لکھتا ہے، اور وہ سچ کے پیچھے اور تحقیق کے پیچھے جانے کی پوری کوشش کرتا ہے، اور سعی کرتا ہے، اور اُن واقعات کو جو گزرے، وہ واقعات جو آنے والے ہیں، اور جس کے بارے میں وہ اُن حال کے واقعات سے اندازہ لگاتا ہے، وہ صحافت کی تحریر کہلاتی ہے۔



اور جو ادیب ہوتا ہے، وہ اس حقیقت سے ایک رمز تلاش کرتا ہے۔ ایک مختلف حقیقت کی طرف جاتا ہے، جسے آپ **Separate reality** کہتے ہیں۔ ایک **Reality** تو وہ ہے جو آپ زندگی میں ہر روز ملاحظہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک **Reality** ایک حقیقت وہ ہے جس کو ایک صاحب نظر یا صاحب بصیرت آدمی اس کی تہہ تک پہنچ کر تلاش کرتا ہے۔ مثلاً درختوں کے پھل جب پکتے ہیں، اور پکنے کے بعد آخری مرحلے کو پہنچتے ہیں تو شاخوں سے ٹوٹ کر زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ اور یہ ایک دنیا بھر کے سارے ملکوں میں، سارے علاقوں میں، ساری جگہوں پر ایک طے شدہ معاملہ ہے کہ اشجار پھلوں کو جب وہ پک جاتے ہیں تو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے لیکن جب نیوٹن ایک بنچ کے اوپر بیٹھ کر اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر کے اس پھل کو جو پک چکا ہے، گرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ ایک **Separate Reality** بیان کرتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اس کی وجہ **Gravity** ہے۔ ادیب بھی اس رمز کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو عین حقیقت میں موجود نہیں ہوتی۔ آپ سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے ایک بہت دیر کا پڑھا ہوا واقعہ یاد آیا، جو شاید ہم سب کو یہ بات سمجھنے میں مدد دے۔ ہمارے یہاں گولڑہ شریف میں پیر مہر علی شاہ صاحب تھے۔ اُن کے نام سے آپ سب واقف ہیں اُن کے صاحبزادے تھے غلام محی الدین صاحب، جن کو عرف عام میں لوگ ''بابو جی'' کہتے تھے۔ وہ بابو جی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کو کوئی اپنی طبع علمی کے اظہار کا اتنا چاؤ نہیں تھا۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضری دینے کی بڑی آرزو تھی، ایک دفعہ بڑی کوشش کر کے میں گولڑہ شریف پہنچا دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے کہا کہ میں بابو جی سے ملنا چاہتا ہوں، تو انہوں نے کہا کہ وہ

سو رہے ہیں، لیکن چونکہ آپ لاہور سے آئے ہیں، اس لیے اُن کو جگا دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، ایسی گستاخی نہیں ہونی چاہیے۔ میرا ملنا نہ ملنا کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ اُن کا سونا، وہ بہت ہی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میں اُن سے مل نہیں سکا، اور یہ حسرت میرے دل میں ہی رہی۔

باؤ جی جب بہت چھوٹے تھے، بالکل بچے تھے۔ آپ نے اگر گولڑہ شریف دیکھا ہو، اور اس کے قریب سے گزرے ہوں جو اسلام آباد والے ہیں، وہ تو روز ہی گزرتے ہیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ بستی کے عین ساتھ ساتھ ایک ریلوے لائن ہے۔ گاڑی بستی کے قریب سے گزرتی ہے، یعنی گولڑہ شریف کا، اور ٹرین کا ایک بڑا گہرا رشتہ ہے۔ گاڑی جب گزرتی تھی تو بابو جی اس گاڑی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ بہت چھوٹے تھے نا۔ تو وہ گاڑی کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔ ایسی گہری محبت میں مبتلا ہوئے کہ دنیا مافیہا کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ وہ گاڑی کے عشق میں ہی مبتلا ہو گئے تھے، اور اسے دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس کو ایک انگریز چلا رہا ہے۔ پیچھے جو جھنڈی ہلانے والا ہے، وہ بھی انگریز ہے، اور جب وہ جھنڈی ہلاتا ہے تو گاڑی وِسل دیتی ہے۔ اور پنڈی کی طرف روانہ ہوتی ہے بابو جی۔ پہلے تو کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے تھے، اور گاڑی گزرتی تھی۔ جب اس چھوٹے بچے کا، اس معصوم کا ہاتھ ہلانا، اور ہر روز اس گاڑی میں استغراق دیکھا، تو جو ڈرائیور تھا وہ بھی جواب میں ہاتھ ہلانے لگا۔ انگریز میں یہ خوبی بڑی تھی، اور آج بھی ہے۔ پھر انہوں نے کیا کیا کہ ایک چھوٹا سا ڈنڈا لیا، اور اس کے اوپر گرین کپڑا باندھ کے اس کی جھنڈی بنائی، اور جیسے ریلوے سٹیشن پر جھنڈی لہرا کر گاڑی کے نکاس کی اجازت دیتے ہیں نا، یہ بچہ بھی وہاں

کھڑا ہو کے گرین جھنڈی ہلاتا تھا، اور وہ گاڑی جاتی تھی۔ کچھ دن تو یہ کھیل رہا، پھر اس کے بعد جب وہ گرین جھنڈی ہلاتے تھے تو ڈرائیور وسل دیتا تھا کہ یس سر! آپ کا آرڈر بھی ہم نے تسلیم کیا، اور ہم گزر رہے ہیں۔ وہ جھنڈی ہلاتے رہے۔ گرین جھنڈی کے ساتھ گاڑی وہاں سے گزرتی رہی۔ پھر ان کو ریلوے سٹیشن پر جانے کے بعد پتا چلا کہ ایک چیز سگنل بھی ہوتی ہے۔ اور جب سگنل ڈاؤن ہوتا ہے تو گاڑی گزرتی ہے، اور جب اَپ ہوتا ہے تو گاڑی نہیں گزرتی۔ چنانچہ انہوں نے لکڑیاں وکڑیاں جوڑ کے اپنے مریدوں سے کہہ کہلوا کے رسیاں تاکیاں لے کے ایک لکڑی کا بڑا سا سگنل بنایا، اور اس کو گھر کے کوٹھے کے اوپر لگا دیا، اور انہوں نے تناؤ باندھ لی۔ اب جب گاڑی کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ رسی ڈھیلی کر دیتے تھے۔ سگنل ڈاؤن ہو جاتا تھا اور گاڑی فرانے بھرتی ہوئی، اور وسل دیتی ہوئی وہاں سے گزر جاتی تھی۔ اس چیز نے ان کو بڑا مشکل میں ڈال دیا، اور ٹائم کا پابند بنا دیا کیونکہ بھئی ظاہر ہے کہ گاڑی تو وقت پر گزرتی ہے، اور اُن کو رات کو جاگنے پر بھی مامور کر دیا، کیونکہ رات کو بھی جاگنا پڑتا تھا، تو پھر گاڑی ان کا سگنل **Receive** کر کے گزرتی تھی۔

تو ایک دفعہ شام کے وقت جب وہ کھیل رہے تھے تو وہ بھول گئے، اور سگنل اَپ رہ گیا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کھیلتے رہے تو وہ جب انگریز نے سگنل اَپ دیکھا تو گاڑی اس نے روک دی کہ سگنل اَپ ہے۔ میں کیسے گزر سکتا ہوں، اور اس نے بڑی **Wistles** دیں، اور جب اس نے وسلیں دیں تو یہ اپنا کھیل چھوڑ کر بھاگے اور جا کر سگنل کو ڈاؤن کیا، اور گاڑی "چھکا چھک" "چھکا چھک" دوڑنے لگی۔ جب تک یہ سگنل ڈاؤن نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کی محبت میں مبتلا صاحب جو تھا، وہ اُن کو ویسے ہی جواب دیتا تھا

جیسا کہ ایک ڈرائیور کو اپنے سگنل مین کو جواب دینا چاہیے، اور وہ اس کے عشق میں مسلسل مبتلا چلے جاتے رہے جو مرید حضرات پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے پاس آتے تھے، اور صاحبزادہ کو دیکھتے تھے ان میں گوالیار کے کوئی صاحب بھی تھے۔ نام تو مجھے ان کا یاد نہیں کیونکہ بڑی دیر کی بات ہے تو انہوں نے کہا کہ صاحبزادے آپ اس کالے کلوٹے انجن کے عشق میں کیوں مبتلا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں چار وجوہات کی بنا پر اس کے عشق میں مبتلا ہوں، اور ان چار وجوہات کی وجہ سے مجھے انجن بہت ہی پیارا لگتا ہے۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ صاحب انہوں نے تو ایک فلسفہ نکالا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آگ کھاتا ہے۔ انگارے ہضم کرتا ہے۔ اپنی جان پر دکھ سہتا ہے اور یہ دکھ سہہ کر جس منزل کا تہیہ کرتا ہے اس کی طرف جاتا ہے۔ دوسرے یہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ یہ جس منزل کا ارادہ کرتا ہے اس پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ اب اگر اس نے یہ تہیہ کیا ہے کہ میں سمہ سٹہ جاؤں گا تو کوئی طاقت اس کو نہیں روک سکتی، اور تیسری صفت یہ ہے اور سب سے پیاری بھی کہ جس نے مجھے اس کے عشق میں مبتلا کیا کہ یہ فسٹ کلاس کے ڈبے کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے، اور تھرڈ کلاس کے ڈبے کو بھی، اور گندی بوگی کو بھی لے کر چلتا ہے۔ یہ یہ نہیں کہتا کہ تو یہاں رہ میں تو فسٹ کلاس کے ڈبے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اور چوتھی چیز یہ ہے کہ یہ صراطِ مستقیم کا مالک ہے۔ نہ ایک انچ ادھر جاتا ہے، نہ ایک انچ اُدھر جو راستہ اس نے طے کر لیا ہے اس کے اوپر چلتا ہے۔ اب انجن تو ہم سب نے دیکھا ہے، لیکن جو Seperate reality اس نوجوان لڑکے نے اس کی بیان کی ہے، وہ ایک اور Reality ہے۔ تو یہ Reality ہے جو ہم لکھنے والے چھوٹے بڑے درجے کے اس کی



تلاش میں رہتے ہیں کہ ایک حقیقت تو یہ ہے جو ہمارے سامنے چلی آ رہی ہے اور ایک حقیقت وہ ہے جو کہیں اور پوشیدہ ہے۔

سائنس کے سٹوڈنٹس یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ جیسے معلوم کی دنیا ہے ایسے ہی نامعلوم کی دنیا بھی ہے۔ اور جو اس کو تسلیم نہیں کرتا، اس کی سوچ بڑی محدود ہو جاتی ہے، کیونکہ لامعلوم کی دنیا پھیل جاتی ہے اور جب کہ اللہ نے فرمایا کہ ''ہم نے آپ کو علم دیا ہے۔ **اِلاقلیلاً** یعنی تھوڑا سا دیا ہے تو باوجود اس کے کہ اس کا **Separate Reality** سے جس کا کہ میں ذکر کر رہا ہوں، کوئی ایسا قریب کا تعلق نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی میں آپ کو تسلیم و رضا کی خو ڈال کے، کچھ ایسے خفیہ راز بھی بتا دیتا ہوں جو میری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ایک لکھنے والا ہوں، جیسا کیسا بھی ہوں میں بھی جانتا ہوں، اور آپ بھی جانتے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک چیز ہوتی ہے اور وہ اسے محسوس کرتا ہے کہ شاید مجھ سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔ مجھے ایک دن خیال آیا اور میں نے سوچا کہ میں لکھنے والے کی حیثیت سے **Broadcaster** کے انداز سے کچھ تھوڑا سا معروف آدمی ہو گیا ہوں اور لوگ مجھے جانتے ہیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنا معروف ہو گیا ہوں اور لوگ مجھے کتنا جانتے ہیں تو میں نے اس کا ایک ٹیسٹ نکالا۔ میں نے ایک کارڈ لیا خالی اور میں نے اس کے اوپر لکھا:

محترمی جناب اشفاق صاحب!

آپ سے ملنے کو بڑا دل چاہتا تھا۔ اللہ کرے، آپ سے ملنے کا کبھی کوئی موقع ملے وغیرہ وغیرہ......!!

جیسے اپنے Fans وغیرہ کو خط لکھے جاتے ہیں نا۔ ویسے ہی میں نے بھی لکھا تو اب جو میں نے ایڈریس لکھا تو وہ یہ تھا کہ ''اشفاق صاحب مشہور ڈرامہ نویس۔ لاہور'' باقی Details نہیں دیں کہ میں کس محلے میں رہتا ہوں۔ یہ لکھ کر میں نے اس کو سپردِ ڈاک کر دیا، تو وہ تقریباً تین دن کے بعد مختلف مہریں لگا مجھے مل گیا۔ اس میں بہاولپور کی مہر بھی تھی۔ رحیم یار خان کی بھی تھی، اور مختلف جگہوں کی تھیں، تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یا اللہ یہ بڑے کمال کی بات ہے۔ اور میں ماشاءاللہ کافی معروف آدمی ہوں۔ تین دن کے بعد ملا لیکن ملا تو سہی۔ اب اتفاق دیکھیے اور قدرت کی ایک Reality کو اُجاگر کرنے کا ایک انداز ملاحظہ فرمایئے۔ تقریباً ایک مہینے بعد یا 15-20 دنوں کے بعد مجھے ایک لفافہ ملا۔ بڑا اچھا سا۔ خوبصورت سا، اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ ''اشفاق احمد۔ بکواسی Broad Caster کو ملے'' اس پر نہ لاہور لکھا تھا، اور نہ میرے گلی محلے کا نام اس کے اوپر صبح 9:30 کی راولپنڈی کی مہر تھی، اور شام 4:30 کی اس کی Delivery کی مہر تھی۔ یعنی اسی دن وہ مجھے مل گیا، یعنی بظاہر اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن میں کبھی کبھی رمز کے انداز میں سوچتا ہوں کہ جب رمزیں واضح ہونے لگتی ہیں۔ تو کئی کئی طریقوں سے عجیب عجیب انداز سے کھلتی ہیں تو لکھنے والوں کے لیے، اور غور کرنے والوں اور محسوس کرنے والوں کے لیے اس Separate Reality کی طرف نگاہ کرنا، اور نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ وہ اس Reality کو اس مختلف حقیقت کو جان کر پھر اپنے لوگوں کے قریب آسکتے ہیں۔ جو لوگ صرف ایک ہی حقیقت کے مارے ہوئے ہوتے ہیں وہ پھر ایک ہی لائن پر چل سکتے ہیں۔ ان کو کبھی ان لوگوں کی تکالیف کا اندازہ نہیں ہوسکتا، جن کی تکالیف

ان سے مختلف ہوتی ہیں، بلکہ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنے جیسی تکالیف ہوں تو اُن کا بھی اندازہ نہیں ہوتا ہے۔

چونکہ ابھی تحریر کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، لیکن ہمارے زاویہ میں ہر طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، اور ہم اس پر ہر ایک زاویہ سے ایک اور Angle سے غور کرتے رہیں گے۔ یہ تو تھی میری بات، جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دی، اور آپ کے سامنے پیش کر دی، لیکن اب میرا بھی ایک مسئلہ ہے جو میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا، اور اسے آپ حل کریں گے۔ کوئی ایسا پیچیدہ تو نہیں ہے، لیکن اکثر مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں وہ مجھے، آپ کو ہم سب کو گھیرے میں لیے ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر نوجوان لڑکے لڑکیاں خاص طور پر اس بات کا اعادہ کرتی ہیں کہ اس دنیا میں مجھے کوئی سمجھ نہیں سکا اور افسوس کہ کسی نے میری حقیقت کو نہیں جانا۔ آپ کی اردو شاعری بھی اس سے بھری پڑی ہے:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

لوگوں کو یہ شکایت عام ہے کہ میرے دل کو کوئی نہیں سمجھتا۔ تو یہ فرمائیے کہ یہ بات کس حد تک درست ہے؟ کیا واقعی آدمی دوسرے آدمی کو نہیں سمجھتا؟ کیا واقعی ناسمجھے جانے والے انسان کے پاس اتنا کچھ ہوتا ہے کہ جس سے دوسرا آدمی فائدہ نہیں اُٹھا رہا ہوتا؟ کیا واقعی ناسمجھے جانے والے انسان کا وجود اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ، ہر مقام پر ہر وقت روتا پھرتا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہے؟

خاضرین میں سے :اشفاق صاحب! بات یہ ہے کہ اگر آپ نے شاعروں کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو میں بڑی سخت بات کرتا لیکن آپ نے شاعری کا حوالہ دیا ہے تو مجھے نسبتاً نرم رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی گمراہ ہوتو دوسروں کو بھی جہالت میں مبتلا کر دیتا ہے، اوران کو اپنی ہی نظروں میں چڑھا دیتا ہے۔ اور وہ اپنی نظروں میں چڑھتے چلے جاتے ہیں، اور دنیا کی نگاہوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جولوگ اپنی نگاہ میں خود ہی چڑھے چلے جاتے ہیں، وہ عموماً سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھے ہیں مگر دنیا ہمیں نہیں سمجھ پائی۔ یہ اُن کی ایک بہت عجیب سی صورتِ حال ہے۔''

اشفاق احمد: ''آپ اختر عباس! کیا سمجھتے ہیں کہ یہ رویہ درست ہے؟''

اختر عباس: ''سر! بات یہ ہے کہ توجہ طلبی کا سارا مسئلہ ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے دنیا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہمارا مشاہدہ زیادہ تیز ہے، اوراسے شیئر کرنے والے زیادہ ہونے چاہئیں کیونکہ لوگ ان سے شیئر نہیں کرتے۔ ان سے پوچھتے نہیں ہیں۔ وہ پھر وہ شکوے سے بھرے ہوئے بولتے ہیں۔

اشفاق احمد: ''ویسے یہ گلہ بڑا عام ہے اختر عباس صاحب''

خالداحمد صاحب: ''سر! میرا خیال ہے کہ جب ایک فرد اپنے مفادات کے مطابق سوسائٹی میں عمل کرنا چاہتا ہے اور سامنے والے افراد اپنے مفادات کے مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں اور جب دونوں کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو جو ہارتا ہے یا جس کے مفادات ضرورت کے مطابق پورے نہیں ہو پاتے ،تو وہ شکوہ کناں ہو جاتے ہیں۔لیکن میرے خیال میں ایسے آدمی کی اپنی پرسنیلٹی میں کمی ہوتی ہے۔ وہ صحیح طور پر سمجھا نہیں پاتے یا اس کی

پرسنیلٹی واضح نہیں ہو پاتی، تو وہ اس کا گلہ عوام الناس سے کرتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں سمجھتا ہے۔

اشفاق احمد: ''آپ لوگوں نے کبھی اپنی ذاتی زندگی میں ایسا اعلان کیا؟''

آغا شاہد: ''اشفاق صاحب! ہوتا ہے اکثر اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ ہر بندے کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے، ایسا موڑ آتا ہے کہ جب وہ Emotional ہو جاتا ہے تو وہ سمجھا نہیں پاتا، لیکن جب وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے تو وہ خود ہی Realise کرتا ہے کہ اس میں میری ہی خامی تھی۔ تب وہ بندہ خود ہی منصف ہوتا ہے، لیکن Emotional ہونے کی صورت میں وہ دوسروں کو Blame دیتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ اس میں ضروری نہیں کہ ان میں پڑھے لکھے لوگ ہی شامل ہوں۔ وہ خواتین جو بہت تعلیم یافتہ نہیں ہوتیں، وہ بھی یہ شکایت کرتی ہیں، اپنی پڑوسنوں سے کہ مجھے کوئی سمجھنے والا ملا ہی نہیں ہے۔ تو وہ جذباتی ہوتی ہیں نا، اس لیے ایسا سوچتی ہیں۔ لیکن اشفاق صاحب ہم سب کا جو Angle ہے، وہ شاید بڑا محدود ہو۔ آپ کی نظر مختلف حوالوں سے مختلف چیزوں پر، لوگوں پہ زیادہ پڑی ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑا اپنے حوالے سے اپنے مشاہدے کے حوالے سے بتائیں کہ آپ کو اس کی کیا وجہ لگتی ہے، اور اس کو کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے، تاکہ اس کا عملاً بھی کوئی فائدہ ہو۔

اشفاق احمد: ''اختر عباس صاحب! میرے ایک استاد تھے جب میں روم میں تھا۔ ان کا نام تھا اونگاریتی، پروفیسر اونگاریتی میں اُن کی باتیں بیان کرتا رہوں گا۔ اُن کو ہم پروفیسر کہتے تھے، لیکن یہ پروفیسر سے اوپر کا درجہ تھا۔ جب وہ تشریف لاتے تھے تو ہم سارے کے سارے، کسی کے پاؤں میں بوٹ ہے کوئی ننگے پاؤں ہے، کوئی پنکھے کے نیچے

بیٹھا ہوا ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے تھے، اور سب ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ آ گئے ہیں اٹھو سب، پروفیسر اونگاریتی، اور وہ تھے Pop Lorlate اٹلی کے اب اُن کی دو کتابیں آئی ہیں ترجمہ ہو کے۔ جب کوئی مشکل ہمیں پڑتی تھی تو ہم ان سے اس قسم کے سوال کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے پوچھا ہے کہ آپ کا بہت وسیع مشاہدہ ہے۔ ایک دفعہ ایک پروفیسر کا اس کی بیوی سے بڑا شدید، جھگڑا ہو گیا، اور اس میں بہت حد تک وہ خاتون ٹھیک بھی تھیں تو جب جھگڑا زیادہ ہو گیا اور یہ معاملہ سٹاف روم میں پروفیسر اونگاریتی کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ دیکھو جھگڑا اپنی جگہ لیکن تم قوت کے سارے اعضاء جو ہیں، اُن کو استعمال کیا کرو اور خاتون سے کہنے لگے کہ بی بی تم صرف آنکھیں استعمال کرتی ہو، پپوٹے استعمال نہیں کرتیں، تو جب تک یہ نہیں ہوگا ساتھ، اس وقت تک کام نہیں ہوگا۔

تو ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ جو آدمی کہتا ہے کہ زندگی میں مجھے کوئی سمجھا ہی نہیں ہے اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ اس شخص کو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی کمینگیاں، اور حماقتیں، اور نالائقیاں لوگوں کے سامنے نہیں آئی ہیں۔ اسے اللہ کا شکر ادا کر کے سونا چاہیے، اور یہ شکوہ بھی نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ مجھے سمجھتے نہیں۔

آپ کا بہت بہت شکریہ اور جو میرے ساتھی ہیں، وہ بھی شکریے کی اس ادائیگی میں میرے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ سب کو آسانیاں دے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا کرے۔



موضوع

بابائے قوم

منظر: اشفاق صاحب نے کالے رنگ کا کرتا، شلوار پہن رکھا ہے۔ اُن کے دائیں بائیں خواتین بیٹھی ہیں۔ پس منظر میں طوطے سے فال نکالنے والا بیٹھا ہے۔ اسلامی فال نامہ کا بورڈ نمایاں ہے۔

مہمان: نیلما ناہید درانی (شاعرہ)

بابائے قوم

پچھلے کئی پروگراموں سے ہم بابوں کے بارے میں بات کرتے رہے ہیں بطورِ خاص، یوں تو زاویہ کے سارے پروگراموں سارے ہفتوں کے اندر کوئی نہ کوئی بابا آ کے کھڑا ہو جاتا رہا۔ لیکن پچھلے تین چار پروگراموں میں بطورِ خاص اس کا ذکر رہا ہے۔ کیونکہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں، اور سوال کرتے ہیں کہ یہ بابا ہوتا کیا ہے، اور اگر کچھ ہوتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں ملتا آپ کو کیسے مل جاتا ہے۔ ہم بھی کیا بابا سے نہیں مل سکتے؟ میں نے جیسے عرض کیا تھا کہ سرخ بتی کے اوپر کئی دفعہ جب کاریں رکی ہوتی ہیں تو کئی آدمی شیشہ اُتار کے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اشفاق صاحب! کوئی بابا ہے؟ میں کہتا ہوں، جیسے کوئی سگریٹ مانگ رہا ہو میں کہتا ہوں نہیں۔ بابا اس وقت تو نہیں ہے لیکن ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہمیں تو کوئی نہیں



ملتا۔ چلے جاتے ہیں۔ تو جب تک اس کی آرزو تمنا نہ پیدا ہو اس وقت تک بابا تو نہیں ملا کرتا۔ آرزو کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ میں آپ سے اس آدمی، اور پانی کے گلاس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں کہ پانی کیا ہوتا ہے، گلاس کیا ہوتا ہے، بابا کیا ہوتا ہے۔ لیکن ایک شدید پیاسا آدمی یہ سارے سوال نہیں کرے گا۔ اس کو یہ آرزو ہو گی کہ مجھے کہیں سے ٹھنڈا صاف ستھرا پانی ملے، اور میں پی لوں، یہ آرزو ذہن میں یا دل کے اندر پیدا ہو جائے کہ مجھے کسی چیز کی تلاش ہے اور میں چاہتا ہوں پھر ملتا ہے۔ لیکن میں آپ کی آسانی کے لیے عرض کرتا ہوں۔ جیسا کہ اب یہ بچی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اتنی ساری باتیں کیسے اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس ضمن میں مجھے یاد اور آپ کی آسانی کے لیے عرض کروں کہ بابا وہ ہوتا ہے جو لینے کے بجائے دینے کے مقام پر ہو۔ بہت سی زبانوں میں باپ کے لیے بابا کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تو تھوڑی سی اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ کہیں اسے بابو کہتے ہیں اٹالین میں۔ اسے باپک کہتے ہیں انڈونیشین میں۔ اس باپو کہتے ہیں انڈیا میں لیکن اس کا Root جو ہے وہ لفظ بابا سے ہے۔ باپ کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھر کے اندر اپنے گھروندے کے اندر، اپنے خاندان کے اندر، دینے والا ہوتا ہے، لینے والا نہیں ہوتا۔ جو شخص بھی کسی انسانی گروہ کے درمیان دینے کے مقام پر ہو وہ بابا ہے اور یہ موٹی سی اس کی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی آدمی کو ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر آپ سمجھیں کہ یہ بابا ہے اور یہ داتا ہے عطا کرنے والا آدمی ہے۔ اور لینے والا ہو سمیٹنے والا ہو، وہ بالکل اس کے الٹ ہوتا ہے، اور عیاری کی بہت ساری منازل طے کر کے ایک گانٹھ کی صورت میں انسان

بن کے زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری زندگی میں جو سب سے پہلے بابا آیا وہ دیر کی بات ہے میں اس وقت سیکنڈ ائیر میں پڑھتا تھا، اور پڑھتا تو میں یہاں لاہور میں تھا لیکن میرا ایک قصبے کے ساتھ تعلق تھا، جہاں مجھے چھٹیوں میں لوٹ کر جانا پڑتا تھا، آنا پڑتا تھا۔ وہیں سے میں نے میٹرک کیا تھا تو وہاں کے لوگ دیہاتی لوگ کسان لوگ وہ ایک بابے کے عشق میں مبتلا تھے۔ اور وہ بابا ایسا تھا، جسے ان لوگوں نے دیکھا نہیں تھا لیکن وہ جان لیتے تھے، سُن لیتے تھے نام۔ کہیں سے خبر پہنچ جاتی تھی اور وہ اس کو بہت مانتے تھے اور اس تمنا اور آرزو میں بیٹھے رہتے تھے کہ وہ آئے گا۔ یہ بابا جو ہمارے دُکھی دن ہیں ان کو کسی طرح سے ہماری زندگیوں سے دور کر دے گا اور ہمیں آسانیاں عطا ہونے لگیں گی لیکن وہ بے چارے اس کے بارے میں زیادہ کچھ جانتے نہیں تھے تو میں بہت حیران ہو کے ان سے کہتا تھا کہ تمہارا بابا کیسا ہے؟ جو تمہارے درمیان میں نہیں ہے اور تمہاری بولی نہیں بولتا اور تم اس کی بولی نہیں سمجھتے تو پھر کیسے تمہارا اور اس کا رابطہ ہو۔ وہ کہتے تھے بھلے ہم اس کی بات نہ سمجھیں وہ ہماری بات نہ جانیں لیکن دلوں کے اندر جو آرزوئیں پوشیدہ ہوتیں ہیں جو تمنائیں ہوتی ہیں دل کی زبان ایک سانجھی زبان ہے جو ساری دنیا میں بولی جاتی ہے۔ اس بابے کو وہ بابا قائداعظم کہہ کر پکارتے تھے اور اس کا نام لے کر وہ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ میں کہتا تھا کہ ایسے بابے کو تم کس طرح سے اپنی زندگیوں میں داخل کرو گے تمہاری کمیونیکیشن پیر دستگیر کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس کی بولی ہم نہیں جانتے جس گیارھویں والے کی ہر گیارہ تاریخ کو ہم نیاز دیتے

ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہماری بات سمجھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہماری بات ان تک کیسے پہنچتی ہے؟ یہ جو پیر دستگیر کا ایک ادنیٰ غلام ہے اور ایک اس کا ماننے والا ہے۔ بھلے اس کی بولی ہم سے مختلف ہو یہ بات ہماری جانے گا، اور سمجھنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح سے جیسے ہمارے بڑوں کی زبان ہمارے بابوں کی زبان چاہے مختلف ہے لیکن ہم اس سے اچھی طرح سے واقف ہیں، اور ہمارے درمیان رابطے کا ایک سلسلہ قائم ہے میں بہت حیران ہوتا تھا کہ ان کا یہ ایمان کس قدر پختہ ہے۔ ہم اس وقت تھوڑے سے متزلزل تھے، پڑھے لکھے نوجوان لڑکے تھے، کچھ دبدبے کا شکار تھے کہ کبھی آگے بڑھتے تھے، کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انہی لوگوں نے لاہور کے اندر پنجاب یونیورسٹی کی سپورٹس گراونڈ میں جہاں اب ہوائی جہاز کھڑا ہے اپنے بابے قائداعظم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کوئی ایک لاکھ کا مجمع بالکل **Pindrop silence** میں بے حس وحرکت خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ اپنی زبان میں بات کر رہا ہے۔ جتنا بھی اس کا گھنٹے کا یا ڈیڑھ گھنٹے کا لیکچر ہوا اس میں اور یہ لوگ سارے کے سارے اس زبان سے واقف نہیں تھے ایک ایک بات اپنے اندر سمو کے اپنے رگ وپے میں اُتار کے وہاں سے اُٹھے۔ باوجود اس کے کہ ان پر بہت مشکل وقت آیا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ان معنوں میں بابا تھا کہ وہ عطا کرنے والا آدمی تھا۔ دینے والا آدمی تھا۔ لینے والی آنکھ نہیں تھی اس نے بڑی چوکھی لڑائی لڑ کے برہمن کے خلاف اور انگریز کے خلاف اپنے ماننے والوں کو ایک ملک لے کر دیا اور جب ملک لے کر دے چکا تو پھر اس نے اپنا آپ اپنا سرمایہ اپنا ورثہ ان سے چھپا کر نہیں

رکھا، اور جب وہ یہاں سے جانے لگا تو اس نے اپنی ساری جائیداد، سب کچھ اپنی قوم کو دے دیا۔ سب سے بڑا حصہ اس نے پشاور کے اسلامیہ کالج کو دیا حالانکہ وہ زیادہ وہاں گئے نہیں تھے لیکن ان کو پسند تھا۔ پھر ایک حصہ علی گڑھ یونیورسٹی کو دیا پھر سندھ مدرسہ کو دیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے، اور یوں ہاتھ جھاڑ کے اور فاطمہ جواُن کی بہت چہیتی بہن تھی اور بظاہر جس کے لیے انہیں بہت کچھ چھوڑ کے جانا چاہیے تھا ان کی اتنی پروا نہیں کی، اور وہ سب کچھ جو اُن کی گاڑھے پسینے کی اپنی کمائی تھی جو انہوں نے وکالت کر کے کمائی تھی یہاں سے کچھ نہیں لیا تھا انہوں نے آپ کے اس اکاؤنٹ سے۔ وہ ساری کی ساری رقم اس کو دے کر یہاں سے رخصت ہو گیا، اس لیے آپ کے دلوں میں ہم جو آپ سے بڑے ہیں تھوڑے سے عمر میں ہمارے دلوں میں اُن کی قدر باقی ہے۔

آپ کبھی کبھی دیکھیں گے یہ ہمارے بابوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے خواتین و حضرات کہ اُن کے مخالف ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دینے کے مقام پر ہوتے ہیں، اور عام آدمی لینے کے مقام پر ہوتا ہے۔ اور جب لینے کے مقام پر آدمی ہو تو وہ زیادہ شرمندگیوں میں گھر جاتا ہے کیونکہ اِردگرد کے لوگ دیکھتے ہیں ان کی نگاہیں ہر وقت دینے والے پر لگی رہتی ہیں تو لینے والا ان لوگوں کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ہمارے بابے جو ڈیرے قائم کرتے ہیں۔ ان کی ٹریننگ کا بھی یہی حصہ ہوتا ہے کہ وہاں آنے والوں کو دینے کی تعلیم دی جائے، اور ایک عام آدمی کو کس طرح سے بابا بنایا جائے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے مرشد سائیں فضل شاہ صاحبؒ، گوجرانوالہ گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اپنی گاڑی



چلاتا ہوا اُن کو ساتھ وہاں لے کر گیا تھا۔ ہم جب وہاں گوجرانوالہ میں پورا دن گزار کر مولوی یاسین صاحب سے مل کر واپس آ رہے تھے تو بازار میں ایک فقیر ملا، اُس نے میرے باباجیؒ سے کہا کہ کچھ دے اللہ کے نام پر۔ انہوں نے اس وقت ایک روپیہ بڑی دیر کی بات ہے، ایک روپیہ بہت ہوتا تھا، تو وہ اس کو دے دیا وہ لے کر بڑا خوش ہوا، دعائیں دیں اور بہت پسند کیا اُس نے باباجی کو۔

انہوں نے اس سے پوچھا شام ہوگئی ہے کتنی کمائی ہوئی؟ وہ ایک سچا آدمی تھا۔ اس نے کہا دس روپے بنا لیے ہیں۔ تو دس روپے بڑے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بہت زیادہ۔ تو انہوں نے کہا کہ دس روپے تو بنا لیے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بات کی تھی: **"دتے میں سے دیا کرو"** یہ ان کا فلسفہ تھا نا۔ اس میں سے یہ نہیں ہوتا کہ جو بہت زیادہ رکھتا ہے وہی دے۔ جس کے پاس دو پیسے ہیں وہ بھی ایک پیسہ دے۔ پچھلی بار جب بات کی تو میں اس کی وضاحت کرنا بھول گیا کہ دتے میں سے دینا۔ اپنے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے دینے سے بھی تقویت آتی ہے۔ جب تک **Post within** نہیں کریں گے اپنی جان کے ساتھ چمٹا کے رکھیں گے، جس طرح تپ محرقہ ساتھ جان کے چمٹ جاتا ہے نا، اور وہ جان نہیں چھوڑتا، اسی طرح سے یہ دولت اور سرمایہ جو ہے یہ انسان کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر چاہے تگڑا کر دے، روحانی طور پر کمزور کر دیتا ہے۔ تو انہوں نے کہا اس فقیر سے کہ تو نے اتنے پیسے بنا لیے ہیں، تو اپنے دتے میں سے کچھ دے۔ تو اس نے کہا بابا میں فقیر آدمی ہوں میں کہاں سے دوں۔ انہوں نے کہا اس میں فقیر

امیر کا کوئی سوال نہیں ہے۔جس کے پاس ہے اس کو دینا چاہیے تو اس فقیر کے دل کو یہ بات بڑی لگی۔ بابا جی سے کہنے لگا: ''میں کیہہ کراں'' انہوں نے کہا کسی کو تو کچھ دے۔ کہنے لگا اچھا وہاں دو مزدور کدالیں کندھے پر ڈالے کہیں سے بیچارے دیہاڑی جو اُن کو ملتی ہے لے کر گھر کو واپس جا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں رسیاں تھیں غالباً بنیادیں کھود کر آئے تھے، جو اس کا نشان لگاتے ہیں۔ تو وہ فقیر بھاگا گیا، اس نے چار روپے کی جلیبیاں خریدیں، چار روپے کی ایک کلو جلیبیاں آیا کرتی تھیں، اور بھاگ کے لایا اور آ کر اُس نے دونوں مزدوروں کو دے دیں۔ کہنے لگا: ''لو اَدھی اَدھی کر لینا'' وہ بڑے حیران ہوئے۔ میں بھی کھڑا اُن کو دیکھتا رہا تو لے کے، وہ خوش ہو کے چلا۔ اور وہ چلے گئے۔ کہنے لگا: ''بڑی مہربانی بابا تیری، بابا بڑی مہربانی، شاباش۔''

تو وہ جو فقیر تھا کچھ کھسیانا، کچھ شرمندہ سا تھا، زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے خیرات دی تھی۔ وہ تو لینے والے مقام پر تھا تو شرمندہ سا ہو کر کھسکا۔ تو میرے بابا جی نے کہا: ''اوئے لکیاں کدھر جانا ایں تینوں فقیر توں داتا بنا دتا اے، خوش ہو، نچ کے وکھا۔'' تو فقیر سے جب داتا بنتا ہے نا تو اس کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے اور اگر باہر نہیں تو اس کا اندر ضرور ناچنے لگتا ہے۔ میرے تو یہ مقدر میں نہیں کہ کبھی دینے کے مقام پر آیا ہوں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو ضرور دیکھا ہے کہ جو دینے کے مقام پر ہوتے ہیں اور ان کی خوشیوں کو دیکھا۔ اسی طرح بابائے قائدِ اعظمؒ نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیا کبھی اللہ آپ کو وقت دے اور بیٹھ کر اس کو جانچنے لگیں، آنکنے لگیں، تولنے لگیں تو آپ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ وہ ایک دبلا پتلا تپ دق



زدہ جسے آخر میں کینسر بھی ہو گیا تھا انہوں نے کسی کو بتائے بغیر کبھی اپنا گلہ کیے بغیر کبھی ''ہائے'' یا ''اُف'' کا لفظ نکالے بغیر اسی معاملے میں لگا رہا کہ میں دوں گا۔ اور اب آج کے سمجھدار سیاستدان، سیاست کے پنڈت لکھنے والے ولایت کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان نے پچھلے ایک سو برس میں صرف ایک ہی لیڈر پیدا کیا ہے اور اس کا نام محمد علی جناح تھا۔ لیڈر ایک ہی تھا، باقی کے لوگ اور بھی بہت سے تھے۔ گاندھی جی کا ہم احترام کرتے ہیں۔ ٹھیک تھے لیکن وہ لیڈر نہیں تھے۔ نہرو ایک لاڈلا بچہ تھا اس کو سیاست میں دلچسپی نہیں تھی۔ اَدب میں البتہ تھی، اس نے خط وغیرہ لکھے، بڑے کمال کے بہت اچھے لکھے۔ لیکن انگریز کے ساتھ سیاست کی لڑائی میں آج کے سیانے کہتے ہیں وہ ایک ہی بندہ تھا جس نے انگریزوں سے کہا کہ آؤ اگر تم میرے ساتھ **Consitutional fight** کرنا چاہتے ہو تو میں، آئین کی جنگ میں لڑنے کے لیے تیار ہوں، میں ایک ایک باریک بات کو کھول کر بیان کروں گا، ادھر آؤ میں ہنر آزماؤں تو تیر آزما۔ ہم بھاگنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے۔ تو گاندھی جی نے اپنا لباس تبدیل کیا، لوگوں کو دھرنے کی تعلیم دی۔ مرن برت (بھوک ہڑتال) کئی کچھ کرتے تھے۔ ان کا اپنا انداز تھا، لیکن وہ انگریز کے ساتھ آنکھ ڈال کر ویسی **Fight** ان کو نہ دے سکے جیسی کہ کرسی کے میدان میں انہی کے مقام پر اس کی چوکھٹے میں لڑائی لڑنے کے لیے یہ تیار تھے۔ قائداعظم کہتے تھے، میں لباس نہیں تبدیل کروں گا تمہاری زبان میں تم سے بات کروں گا۔ میں تمہارے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق تمہارے قانون کے مطابق تم سے لڑائی کروں گا۔ اور پھر بار بار انہوں نے کہا پاکستان تو بعد

کی بات ہے۔ اللہ کرے آپ اس کو پڑھ سکیں اور پوری تفصیلات کے ساتھ اس کی طرف جا سکیں تو اس بابے نے جو کہ دیہاتیوں، کسانوں، دہقانوں کا بابا تھا، قائداعظم اسے کہتے تھے اس نے دینے کے مقام پر کھڑے ہو کر کیا کچھ عطا کیا، اس کی تفصیلات آپ اپنے طور پر جان سکیں گے۔ اور وہ جو بابا، بابا میں ذکر کیا کرتا ہوں وہ کہاں سے چل کر کہاں تک بابا آتا ہے اور اس ذیل میں کون کون لوگ آ جاتے ہیں۔ میں نے آپ سے پچھلی مرتبہ گل حیدر کا ذکر کیا تھا جو ہمارے یہاں تھے وہ بھی ایک بابا تھے زندہ ہیں۔ قائداعظم وہ بھی ایک بابا ہیں یہ گزر جانے والا فقیر جو داد و دہش کرتا ہے۔ یہ بھی ایک اپنی طرز کا بابا ہے۔ تو اس میں ایک آخری بات جو بہت عجیب و غریب ہے وہ یہ میرے بچے میرے پوتے اور میری پوتیاں اور بہت ذہین آپ جیسے لڑکے لڑکیاں، تھوڑے دن ہوئے وہ بیٹھے ہوئے تھے اور یہ ذکر کر رہے تھے آپس میں کہ اگر اوپر کے لوگ ٹھیک ہو جائیں تو پھر نیچے کے لوگ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ عام خیال ہے۔

میں نے کہا: ''دیکھو، مجھے اجازت دو گے'' کہنے لگے: ''نہیں بابا آپ بالکل الٹی بات کیا کرتے ہیں'' میں نے کہا: ''نہیں اتنی سی اجازت دو کہنے کی کہ اگر اوپر کے لوگ ٹھیک ہو جائیں اور خدانخواستہ نیچے کے نہ ہوئے تو پھر ہم کیا کریں گے'' کہنے لگے: ''نہیں دیکھیے یہ مفروضہ نہیں اوپر سے دیکھ کر ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں اور وہی کرتے ہیں'' میں نے کہا: ''پیارے بچو یاد رکھو اور لکھ لو اسے اپنے دل کی ڈائری میں کہ ایک ملک بنام پاکستان اور اس کے رہنے والے پاکستانی دنیا کی اس خوش قسمت ترین قوم میں سے ہیں جن کو نہایت

نیک نہایت ایماندار، نہایت Honest نہایت شفاف، نہایت ذہین، نہایت بڑا سائنسدان، نہایت بہترین دوسری زبان جاننے والا، نہایت اعلیٰ درجے کا وکیل عطا کیا ہے اور جس نے اس قوم سے تانبے کا ایک پیسہ بھی محنت کے طور پر نہیں لیا، اور کمال کی اس نے لیڈر شپ فراہم کی۔ جو آپ آج مانگ رہے ہیں۔ لیکن قوم نے اس کے جواب میں کیا کیا کہ ائیر پورٹ کے آدھے راستے کے اوپر اس کی موٹر کار کا پیٹرول ختم ہو گیا اور اس نے اپنی جان آدھے راستے میں جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ یہ ہوتا ہے زندگی میں۔ اس بات کی تلاش نہ کرو کہ وہاں سے ٹھیک ہوں گے تو نیچے آئیں گے۔ ہم سب کو اپنے اپنے مقام پر ٹھیک ہونا ہے۔ خدا کے واسطے یہ مت کہا کرو اے پیارے مزدور، کسانو، اَن پڑھ لوگو! کہ اگر بڑے لوگ نماز پڑھیں گے تو ہم پڑھیں گے۔ ورنہ تب تک ہم بیٹھے ہیں، نماز تو تمہاری اپنی ہے بابا۔ اچھے ہونا تو تمہارے اپنے بس میں ہے۔ ذمہ داری تو ہماری اپنی ہے۔ یہ کیا بہانہ لے کر بیٹھ گئے۔'' یہ بات جو میں نے اپنے بچوں سے کہی یہ میں آپ سے بھی کہنا چاہ رہا تھا، اور کہہ رہا ہوں، اور بڑی دردمندی کے ساتھ کہہ رہا ہوں، اور اس دین کو، اس ذمہ داری کو، جو ہمارے کندھوں کے اوپر ہے اور جس کا ہم مداوا نہیں کر سکتے کہ ہم نے کیا سلوک کیا وہ شرمندگی ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے ساتھ چلتی رہے گی، اور ہم سارے کے سارے اس کے دیندار ہیں۔ کسی ایک بندے کو یا کسی ایک حکومت کو یا کسی ایک سسٹم کو اِس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں نے پچھلے پروگرام میں عرض کیا تھا کہ یہ ملک، یہ پاکستان یہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی ہے۔ اس کا احترام اور اس کا



ادب ہم پر واجب ہے۔حکومت کا بالکل خیال نہ کریں۔حکومت والوں کا نہ اَدب کریں ان کو نہ مانیں جو کہنا چاہتے ہیں ان کے خلاف کہیں مجھے اعتراض نہیں لیکن اس ملک کے اس سرزمین کے اس دھرتی کے خلاف اگر آپ نے کوئی بات کی تو پکڑے جائیں گے اور بڑے عذاب کی صورت سے گزریں گے۔الحمداللہ ابھی تک کسی نے ملک کے خلاف کوئی بات نہیں کی باریکیاں سی نکال کے کچھ سیاست میں سے اُلٹی پلٹی باتیں بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور اگر آپ کو کوئی دریدہ دہن یا ایسا گندا ذہن آدمی ملے، جو قائداعظم کی ذات میں کوئی کیڑے نکالنے کی کوششیں کرتا ہے تو اس کو ضرور قریب سے جا کر دیکھیں، وہ دینے والوں میں سے نہیں ہوگا، لینے والوں میں سے ہوگا۔ پاکستان کے رہنے والو زندہ رہو خوش رہو پائندہ رہو۔اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔شرف عطا فرمائے،اللہ حافظ۔



موضوع

بلوچوں کا ڈیرہ

منظر: ایک میز کے اِرد گرد سب لوگ بیٹھے ہیں۔ اشفاق صاحب سفید شلوار قمیض پہنے ہوئے ہیں۔اُن کے دائیں بائیں خواتین بیٹھی ہیں اور پس منظر میں ایک گھڑی ساز بیٹھا اپنے کام میں مصروف ہے۔

مہمان: شہزاد احمد (شاعر)

بلوچوں کا ڈیرہ

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے کبھی اونٹ کی سواری کی ہے یا نہیں۔ پھر بھی ایک اندازے کے مطابق یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اونٹ دیکھا ضرور ہے۔ ہم نے اپنے بچپن میں اونٹ کی بہت سواری کی۔ اس لیے کہ ہمارے گھر کے قریب جس گاؤں میں میں رہتا تھا، وہاں بلوچوں کا ایک ڈیرہ تھا۔ بلوچ، اور اونٹ لازم و ملزوم چیزیں ہیں، اور بلوچ لوگ بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں میری زندگی پر اُن کا بڑا خوشگوار اثر ہے۔ وہ اس لیے کہ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے جھڑکا اور شاید ایک تھپڑ بھی مارا۔ میں منہ بسورتا ہوا اماں بلوچن کے



گھر چلا گیا۔ تو اس نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا، ابا جی نے مارا ہے۔ وہ چادر لے کر غصے سے ہمارے گھر آ گئی۔ اور کہنے لگی، ڈاکدار تو نے بچے کو کیوں مارا؟ کہنے لگے، میں نے اس کو مارا نہیں بلکہ جھڑکا۔ کہنے لگی جھڑکا بھی کیوں۔ وہ سمجھتی تھی کہ جھڑکا بھی اس قسم کی چیز ہے۔

اونٹ پر ہم بہت سواری کرتے رہے۔ پھر اس کے درمیان ایک بڑا لمبا وقفہ آ گیا **1946**ء میں جب پاکستان کی تحریک بڑے زوروں پر تھی تو ہمیں دریائے ستلج کے کنارے ایک لمبے سفر پہ تبلیغ کے لیے جانا تھا تا کہ پاکستان کی طرف لوگوں کا جھکاؤ پیدا کیا جا سکے۔ وہاں تقریباً کچھ ایسے لوگ تھے جن کا جھکاؤ پاکستان کی طرف بہت کم تھا اور وہ مسلم لیگ سے ناواقف تھے۔ ہمیں وہاں اونٹ پر جانا پڑا۔ ہمارے پاس دو اونٹ تھے۔ دونوں جوان علی گڑھ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ یہ ایک لمبا سفر تھا ہم نے ایک دن میں ساٹھ میل کی مسافت اونٹ پر طے کی، پھر ہماری خوش قسمتی سے وہاں راستے میں دو ڈاکو مل گئے۔ ایک کا نام گامن تھا، ایک کا نام سجاول تھا۔ رنگ دار بندوقیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں روک لیا تم کدھر جا رہے ہو۔ ہم نے بتایا ہم ایک مشن پر جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم ڈاکو ہیں ہمیں ایک کراڑ کو لوٹنے جانا ہے ہمیں اونٹ دے دیں۔ ہم نے کہا، اونٹ ہمارے لیے بہت ضروری ہیں، تم کراڑ کو بعد میں لوٹ لینا ہمارا کام زیادہ ضروری ہے۔ انہوں نے کہا نہیں ہمارا کام تم سے زیادہ ضروری ہے۔ خیر وہ ایک لمبی کہانی ہے وہ پھر کبھی بعد میں سناؤں گا۔ پھر دونوں ڈاکو

ہمارے دوست بن گئے اور اونٹ پر بیٹھنے کا طریقہ بتایا کہ اگر کاٹھی نہ بھی ہو تو پھر اونٹ کی کوہان پر لانگڑی مار کر بیٹھا جاتا ہے ہر ایک کام کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا تھا آپ سے کہ چند دن پہلے کراچی جانے کا اتفاق ہوا میں تقریباً آدھی صدی کے بعد سن پینتالیس کے بعد پاکستان کی سرحد کے اندر اونٹ پر بیٹھا۔ کلفٹن میں آپ نے دیکھا ہوگا، اور ہم نے بھی اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کیا اونٹ پر بیٹھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُونٹ اُٹھنے کے انداز میں دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی پچھلی ٹانگیں کھڑی کرتا ہے دنیا کے دوسرے سارے جانور اگلی ٹانگیں پہلے کھڑی کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے اس کے اوپر بیٹھنے والا سب سے پہلے سجدہ کرتا ہے یہ اللہ نے اس کا ایک کام رکھا ہے۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے سجدہ خود بخود ہو جاتا ہے پھر وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا ہے ہم نے کافی وقت ان اونٹوں کے ساتھ گزارا، لیکن میرے ساتھ عجیب وغریب واقعات گزرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ اس اونٹ کے رشتے سے، اور اس کے حوالے سے بھی میں یوں ایک الجھن میں بھی گرفتار ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اونٹ کے بارے میں بھی قرآن پاک میں کہتا ہے کیا تم نے اونٹ کو دیکھا کہ کس طرح کا جانور بنایا۔ یعنی اس کے عجائب وغرائب ابھی تک پوشیدہ ہیں، اور سارے کے سارے اس کے خصائص لوگوں کے سامنے نہیں آئے، اتنا ہم جانتے ہیں یہ میلوں اور دنوں تک سفر کر سکتا ہے پانی کے بغیر۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں لیکن یہ اپنے

انداز کا بڑا ہی خوب صورت جانور ہے۔ بے حد خوب صورت۔ اگر آپ نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا، اب آپ کو موقع ملے تو اسے ضرور دیکھیے گا۔ اللہ کرے آپ جائیں یا آپ گئے ہوں گے، جدے سے مدینے جاتے ہوئے بڑی خوب صورت سڑکیں ہیں، کبھی کبھی ریگستان کے لق ودق ٹوٹے اور کچے علاقے آ جانے پر آپ کو چلتے پھرتے اونٹوں کی کچھ قطاریں نظر آئیں گی۔ ان کے مالکوں نے کھلے چھوڑے ہوتے ہیں چاندی جیسی ریت پر جیسے چاندی سے بدن لے کے دھوپ کے اندر ایک عجیب گل کھلاتے ہوئے چلتے ہیں وہ نظارہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ہم بس پر سفر کر رہے تھے اور بس سے سر نکال نکال کر بڑی دیر تک ان کو دیکھتے تھے، اللہ میاں نے کیسی خوب صورت مخلوق پیدا کی ہے۔ اس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ اسی سلسلے میں مجھے کچھ یاد آیا۔ پاکستان میں جب امریکہ کا صدر آیا، ابھی تک شاید ایک ہی آیا ہے، جس کا نام **London B. Jhonson** تھا۔ وہ کراچی اترا، تو جس چیز نے لنڈن بی جانسن کو متاثر کیا، وہ عجیب چیز اونٹ تھا۔ ہماری بہت گاڑیاں تھیں جو سامان، اسباب نقل وحرکت میں کام آتی تھیں، بہت سارا سامان ڈھوتی تھیں۔ اونٹ گاڑیاں تھیں، یہ **1953,1952**ء کی بات ہے وہ اونٹ سے اتنا متاثر ہوا تو اس نے کہا میں تو اونٹ امریکہ لے کر جاؤں گا، اور اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اونٹ کو تو نہیں لے جا سکا اس اونٹ کا ساربان جو کہ شتربان تھا بشیر اس کو ساتھ لے گیا، اور بشیر بچارے کو بڑی مصیبت پڑی، اور وہ روتا تھا کہ اونٹ کی وجہ سے مجھے امریکہ

جانا پڑ رہا ہے۔ وہ امریکہ جانے سے گھبراتا تھا کہ مجھے وہاں کی بولی نہیں آتی۔ اخبار میں بیان دیا، میں وہاں جا کر کیا بات کروں گا، امریکہ جا کر مجھے کیا لینا ہے۔ مجھے اونٹ گاڑی چلانی ہے، الغرض اس کو جانا پڑا۔ اس نے نئی رومی ٹوپی خریدی۔ اگر آپ نے تصویریں دیکھی ہوں تو بے چارے نے یہ کچھ کیا، وہ آزاد آدمی تھا۔

پچھلے دنوں میں اونٹ کے بہت قریب رہا۔ مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا، اونٹ کے جسمانی طور پر قریب رہ کے، اس عمر میں اس کی سواری کرنے کے بعد ایک اور انداز سے اونٹ میری زندگی کے میری روح کے اور میرے وجود کے، اور میری سائیکی کے قریب آ جائے گا۔

میں آپ سے اونٹ کی باتیں کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اس اونٹنی کا خیال بار بار آتا ہے جو اونٹنی حضرت صالحؑ کی اونٹنی تھی، اور جو ایک معجزے کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ قوم ثمود کی طرف صالحؑ کو اللہ نے بھیجا تھا، اور وہ بہت اونچے درجے کے نبی تھے انہیں حکم ہوا کہ جا کر اس بے ہودہ قوم کو راہِ راست پر لاؤ۔ وہ بڑی بگڑی قوم تھی۔ بیشتر میں خرابی یہ تھی کہ ان کے پاس دولت بہت زیادہ تھی، علاقہ بہت سرسبز تھا۔ اُردن کے علاقہ سے لے کر عرب تک اور مدینے شریف سے لے کر تبوک کے درمیانی علاقے میں وہاں جا کر ثمود کی جغرافیائی حد ختم ہوتی ہے۔ لمبا چوڑا علاقہ تھا اور ثمود کے لوگ اپنے تئیں تکبر کے مارے ہوئے اور اپنے آپ کو بہت برتر سمجھتے ہوئے اونچے پہاڑوں کو تراش کر چھینی ہتھوڑی سے



اسے چھیل چھیل کران پہاڑوں کے اندر نہایت خوب صورت محل بناتے تھے۔ یہ ان کا بڑا کمال تھا، یعنی انہوں نے کوئی لینٹر نہیں ڈالا کوئی اینٹ و پتھر جمع نہیں کیے، پہاڑ کو چھیلنا، کھرچنا شروع کر دیا، اور اس کے اندر ایسے اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے، ستون محرابیں بنائی ہیں کہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی اگر آپ چاہیں تو اُردن کے علاقے میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ سلائیڈیں بھی ملتی ہیں۔ اگر آپ کو جغرافیے کا شوق ہے تو جیوگرافک میگزین میں گاہے بگاہے ان محلات کی وہ تصویریں فوٹوگراف کی صورت میں، اور ڈرائینگ کی صورت میں آتی رہتی ہیں۔ تو وہ لوگ بڑے معتبر لوگ تھے، اور وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے، تب اللہ نے ایک پاکیزہ نبی حضرت صالحؑ کو ان کے پاس بھیجا کہ جا کر ان کو اللہ کا پیغام دیں تو ان لوگوں کو نبیوں کے اوپر جو اعتراض رہا تھا، جتنے بھی نبی ان کے پاس بھیجے گئے ہیں، ایک ہی اعتراض رہا ہے کہ آپ کیسے نبی ہو سکتے ہو؟ آپ ہمارے جیسے انسان ہو۔ اور کہتے تھے کہ تُو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور پھر تیسری بات کہ تو غریب آدمی ہے اور غریب آدمی کیسے نبی ہوسکتا ہے؟ نبی تو بہت امیر آدمی کو ہونا چاہیے۔ متکبر کو ہونا چاہیے۔ فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ تم کیسے نبی ہو سکتے ہو تیرے بازوؤں میں سونے کے کنگن بھی نہیں۔ اور بھی جتنے پیغمبر تھے ان کے ساتھ بھی یہی تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ بھی۔ وہ یہی بات بار بار دہراتے کہ اگر تو سر بلند ہوتا اور تیرے بھی اتنے اونچے محل ہوتے جتنے لوگوں کے پاس ہیں تم نے بھی ایسی عمارتیں بنائی ہوتیں، اے صالحؑ تو ہم تم کو پیغمبر مان لیتے لیکن اب تو تُو

ایک عام آدمی ہے۔ٹھیک ہے بھلے آدمی ہو لیکن تمہاری اقتصادی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھیں ہم بھی بار بار Acknowledged Condition کی بات کرتے ہیں۔ جب بھی کبھی مصیبت پڑتی ہے بوجھ پڑتا ہے تو آپ بجائے اس بوجھ کو بلاواسطہ طور پر Directly برداشت کرنے کے لیے ہمیشہ پلٹ کر اکنامکس کی طرف جاتے ہیں۔ ہماری اکنامکس کمزور ہے اس لیے کام نہیں کرتے۔ ہم نیک اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ ہم بہادر اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ اچھے انسان اس لیے نہیں بن سکتے کہ مالی طور پر کمزور ہیں۔ تو وہ بھی یہ کہتے تھے کہ تم مالی طور پر بہت کمزور ہو۔ تمہارے پاس اتنے بڑے محل ہوتے جتنے ہمارے پاس ہیں، پھر ہم نبی مانتے۔ لیکن وہ کہتے مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں تم کو بھلائی کے راستے کی طرف بلاتا ہوں تمہارا اس میں فائدہ ہے۔ میں تم سے اس کے عوض کوئی ٹیوشن فیس نہیں مانگتا جو کچھ ہے میں مفت میں دیتا ہوں اور میرا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تو انہوں نے کہا ہم تجھ کو پیغمبر نہیں مانتے، اگر ہم طبیعت پر بوجھ ڈال کر آپ کو پیغمبر مان بھی لیں، تو اس کے لیے ایک شرط ہے کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھا دو ثمود قوم نے کہا۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا، آؤ تم کون سا معجزہ چاہتے ہو، لیکن انہوں نے Warn کیا کہ معجزہ رونما ہو چکنے کے بعد پھر اگر تم نے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو نہ مانا تو پھر تم پر عذاب آ جائے گا۔ خوش نصیب ہیں وہ قومیں، جنہوں نے معجزہ طلب نہیں کیا، لڑائی جھگڑا کرتے رہے ہیں، لیکن معجزہ نہیں مانگا، وہ بچ گئے لیکن اگر معجزہ مانگ لیا جائے اور معجزہ طلب



کرلیا جائے اور وہ رونما ہو جائے پھر بھی نہ مانا جائے تو پھر عذاب طے شدہ بات ہے۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں ہم برداشت کرلیں گے لیکن اگر تو معجزہ رونما کرے گا تو۔ دیکھیے ان ظالموں نے معجزہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا، ہم یہ چاہتے ہیں سامنے چٹیل پہاڑ ہے اور بہت چکنا و مضبوط ہے کروڑوں سال سے اپنی جگہ پر قائم ہے ہم یہ چاہتے ہیں تیرا اللہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی پیدا کرے۔ اب پہاڑ کا اور اونٹ کا کوئی تعلق نہیں اور وہ اونٹنی آئے ہمارے ساتھ ہماری بستی میں رہے تو پھر ہم مانیں گے کہ تم پیغمبر ہو۔

چنانچہ انہوں نے دُعا کی، اور اللہ سے اس معجزے کو طلب کیا کہ اگر یہ لوگ اس طرح سے ہی مان جائیں تو ان کا فائدہ ہے۔ ان چٹیل چکنے پہاڑوں کے درمیان میں سے اللہ کے حکم سے اونٹنی نمودار ہوئی۔ اور ان کے آگے چلتی آ رہی ہے۔ پہاڑوں کا قد بت بھی بہت بلند تھا، وہ اونٹنی بھی چاندی کا ایک مرقع نظر آتی تھی، چلتی ہوئی آ گئی اور بستی میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور ظاہر ہے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ہوگی وہاں آ کے۔ اُن لوگوں نے اسے دیکھا اور حیران و ششدر بھی ہوئے کہ اونٹنی تو پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن اب ہم اس کو کیا کریں۔ تو حضرت صالحؑ نے فرمایا تمہاری خواہش کے مطابق تمہاری آرزو کے مطابق یہ اونٹنی انہی پہاڑوں کے درمیان میں پیدا ہو کر آپ کے درمیان آ گئی ہے۔ اور اب یہ آپ کی مہمان ہے۔ اب اللہ نے ایک شرط عائد کی ہے کہ بستی کے ایک کنویں سے یہ پانی پیئے گی، اور اس کا ایک دن مقرر ہوگا اس دن وہاں سے کوئی دوسرا آدمی پانی نہیں لے سکے گا۔ نہ مویشی نہ چرند

پرند نہ انسان۔ اونٹنی ہماری معزز ترین مہمان ہے اس کی دیکھ بھال کرنا ہمارا فرض ہے۔ انہوں نے کہا بہت اچھا ہم ایسا ہی کریں گے۔ کچھ دن تو انہوں نے اونٹنی کو برداشت کیا، اور باری کے مطابق جو دن مقرر تھا اسے پانی دیتے رہے لیکن پھر انسان انسان ہے ان میں ایک آدمی ایسا پیدا ہوا جس نے مزید آٹھ آدمیوں کو ورغلایا اور وہ نو ہو گئے۔ انہوں نے کہا یہ کیا شرط ہم نے اپنے آپ پر عائد کر لی ہے اور اس اونٹنی کی کیا حیثیت ہے ہم اس کا کسی نہ کسی طرح سے قلع قمع کر دیں۔ چنانچہ انہوں رات کے وقت اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، جو کہ ٹخنوں کے اوپر کا حصہ ہوتا ہے۔ تو اونٹنی ظاہر ہے وہاں پر اپاج ہو کر بیٹھ گئی۔ صبح کو جب سب لوگ بیدار ہوئے، اور اونٹنی کے پانی پینے کی باری تھی، لیکن وہ تشریف نہ لائی، کیونکہ وہ وہاں نہ تھی۔ جب حضرت صالحؑ کو علم ہوا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ تو پھر انہوں نے اپنی قوم سے کہا، یہ بہت برا ہوا، نہ صرف تم نے اس معجزے کو جھٹلایا بلکہ اس مہمان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اب تین دن کے اندر اندر تمہارا قلع قمع ہو جائے گا، اور تم نیست و نابود ہو جاؤ گے۔ پھر آنے والی تاریخ میں لوگ انگلیاں اُٹھا کر بتایا کریں گے کہ یہ ثمود کے رہنے کی جگہ تھی، اور یہ اُن کے محل تھے جو ویران پڑے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح ویران رہیں گے۔ چنانچہ جیسا فرمایا گیا تھا بالکل ویسے ہی ہوا پہلے دن جیسے کہ بتاتے ہیں کہ ان کے منہ پیلے ہوئے اگلے دن بے حد سرخ ہو گئے پھر کالے۔ پھر ایک ایسی چنگھاڑ، جیسے آج کل بم بنے ہیں، چنگھاڑ آئی، وہ سارے کے سارے اوندھے منہ گر گئے اور نیست و نابود ہو گئے۔



ایک دفعہ مجھے ایک دوست کے پوتے کی شادی پر اسلام آباد جانا ہوا تو اسلام آباد پہنچ کر مجھے ایک پیغام ملا کہ ایک بابا ہیں جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بابوں کا بڑا دیوانہ ہوں آپ کو علم ہے۔ پچھلے ہفتے آپ سے بابا کی بات کر رہا تھا، جو ہمارے ساتھ اسی ٹی وی سٹیشن کا رہنے والا تھا۔ لیکن بابوں کے زائچے بابوں کی شکل وصورت، اور ان کے ڈھانچے ان کے حلیے ان کے مزاج بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مجھ سے یہ آ کر نہ پوچھیں، ہر بابا میٹھا بابا نہیں ہوتا میرے سائیں فضل شاہ صاحب جیسا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں ان سے ملنے ان کے پاس گیا۔ دھوپ تھی پہاڑی علاقہ تھا۔ میرے گلے میں چھوٹا سا صافہ تھا۔ آپ کو پتا ہے پہاڑوں کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے: ''تم بڑی مٹھار مٹھار کے باتیں بناتے ہو اور باتیں سناتے ہو میں تم کو **Warn** کرتا ہوں'' یہ لفظ انہوں نے استعمال کیا **Warn** کرنے کے لیے بلایا ہے۔ یہاں پر تم لوگ بہت بے خیال ہو گئے ہو اور تم لوگوں نے توجہ دینا چھوڑ دی ہے اور تم ایک بہت خوفناک منزل کی طرف رجوع کر رہے ہو۔ دیکھو! کہنے لگے میں تم کو بتاتا ہوں یہ پاکستان ملک ایک معجزہ ہے۔ یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ تم بار بار کہا کرتے ہو ہم نے یہ کیا پھر یہ کیا پھر سیاست کے میدان میں یہ کیا پھر اپنے قائد کے پیچھے چلے ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے مت کہو۔ پاکستان کا وجود میں آنا ایک معجزہ تھا اتنا بڑا معجزہ ہے جتنا بڑا قوم ثمود کے لیے اونٹنی کے پیدا ہونے کا تھا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالحؑ کی اونٹنی سمجھنا چھوڑ دو گے نہ تم

رہو گے نہ تمہاری یادیں رہیں گی۔ میرے گلے میں موجود صافے کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری کیا کیفیت ہوگی۔ انہوں نے کہا تم نے صالحؑ کی اِس اونٹنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا 52 برس گزر گئے تم نے اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہوا ہے جو ثمود نے کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں اور باہر کے رہنے والوں دونوں کو Warn کرتا ہوں تم سنبھل جاؤ ورنہ وقت بہت کم ہے اس اونٹنی سے جو تم نے چھینا ہے اور جو کچھ لوٹا ہے اندر کے رہنے والو اس کو لوٹاؤ، اور اس کو دو اور باہر کے رہنے والو ساؤتھ ایشیا میں سارے ملکوں کو Warn کرتا ہوں اس کو کوئی عام چھوٹا سا معمولی سا جغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی ہے ہم سب پر اس کا ادب اور احترام واجب ہے۔ اس کو ایک معمولی ملک نہ سمجھنا اور اس کی طرف رُخ کر کے کھڑے رہنا، اور اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہو اور اس کو Recompensate کرو۔

میں اُن کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا، اور خوف زدہ ہو کے کھڑا رہا، اور پھر اُن کو سلام کر کے، سر جھکا کے واپس چلا آیا۔ میری دعا ہے، اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔



موضوع

خیال کی قوت

منظر: اشفاق صاحب نے کرے کلر کا کرتا اور شلوار پہن رکھی ہے اور اوپر ڈبیوں والا سویٹر بھی پہن رکھا ہے۔ اُن کے دائیں بائیں صوفے پر خواتین بیٹھی ہیں۔ ڈرائنگ روم کا منظر ہے۔

مہمان: خالد احمد (شاعر)

خیال کی قوت

یہ سوال میری روح اور میرے ذہن کے ساتھ اکثر ٹکراتا ہے۔ جس میں لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ آپ "بابوں" کا ذکر کرتے ہیں ہمیں تو "بابے" کوئی ملتے نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھی اونچی کرسی لگا کر گھر میں بیٹھے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی بابا پکڑ کے لاؤ اور ہماری خدمت میں پیش کرو ایسا تو ہوتا نہیں ہے۔ اس کے لیے تو کچھ مختلف Effort کوشش جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جیسے آپ اور دوسرے کاموں کے لیے کرتے ہیں۔ میں اب لوٹ کر بہت پیچھے کی طرف جا رہا ہوں۔ میری عمر میں پہنچ کر پرانی باتیں زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد آتی ہیں اور کل کیا کھایا تھا، وہ نہیں پتا چلتا۔ مثلاً میں راستے میں سوچتا آ رہا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کل کیا کھایا تھا تو عین ٹی وی کے

دروازے پر پہنچ کے یاد آیا کہ آلو مٹر کھائے تھے۔ لیکن زیادہ پرانی باتیں مکمل وضاحت اور تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ میرا گاؤں، گاؤں نہیں بلکہ ایک قصبہ تھا جس کی آبادی کوئی پچیس ہزار کے قریب تھی۔ وہاں ہم رہتے تھے لیکن وہ پچیس ہزار کا قصبہ جنوری کے مہینے میں دس تاریخ کے بعد تین لاکھ کا قصبہ بن جاتا تھا وہاں ایک میلہ لگتا تھا۔ اسے ہم ''ماڈھی'' کا میلہ کہتے تھے۔ جنوری کی دس بارہ، تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو ضلع سے پولیس آتی تھی۔ دُور دُور سے تماشے تھیٹر آتے تھے جو اپنی زندگی میں، میں نے دیکھے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھایا کہ مجھے ڈرامہ لکھنا آنے لگا۔ وہ تھیٹر اور طرح کے ہوتے تھے لیکن ان کے پس منظر میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو پرانے پارسی تھیٹروں میں تھا۔ اس میلے میں دو بڑے سرکس آیا کرتے تھے۔ میں چونکہ چھوٹا تھا اور میری عمر پانچ سال تھی اس وقت سرکس میں زیادہ دھیان دیتا تھا۔ جانوروں کے ساتھ وابستگی ہوتی تھی۔ وہاں ایک رتنابائی گرینڈ سرکس بھی آتا تھا۔ ایک رتنابائی بنگالی عورت وہ کرتب بھی کرتی تھی اور اس سرکس کی مالک بھی تھی۔ وہ اتنا بڑا جوڑا کر کے اور پلس فور پہن کے پاؤں میں چمڑے کے جوتے اور وردی اور ہاتھ میں ہنٹر پکڑے ہوتی تھی۔ اس سے سارے جانور دبکتے تھے۔ میں نے کوئی ایسا رنگ ماسٹر اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا جو شیروں کے ساتھ جا کر پٹاخہ مار کے بات نہ کرے بلکہ وہ موٹا ''نگا'' ان کے منہ پر مارے اور ان سے کام کرائے۔ رتنابائی کے سات ہاتھی تھے جو بڑے وزنی تھے۔ میں بڑی بہادری کے ساتھ اُن کے سامنے جا کر کھڑا تو ہو گیا لیکن جب ہاتھی آگے کو جھکا تو میں ڈر کے مارے پیچھے کی طرف ہو گیا۔ میرے ساتھ میرے والد صاحب بھی تھے جو

ویٹرنری ڈاکٹر تھے اور ہاتھی کا ٹمپریچر لینے آئے تھے۔ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ اس کی سونڈ پکڑو لیکن میں ڈرا۔ اس پر میرے باپ نے پوچھا کہ تم اس سے ڈرے کیوں؟ میں نے ان سے کہا کہ میں ڈرا اس لیے ہوں ابو کہ یہ ہاتھی جس ''کلّے'' کے ساتھ باندھا گیا ہے وہ بڑا کمزور ہے اور میرا خیال ہے کہ زمین میں فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ یہ اگر زور دے تو یہ اسے اکھاڑ پھینکے گا۔ میرے والد نے کہا یہ ایسا کر نہیں سکتا کیونکہ یہ ''کلّے'' کے ساتھ نہیں بندھا ہوا یہ اس خیال کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ ''کلا'' مضبوط ہے۔ اگر یہ اپنے خیال میں تبدیلی لائے تو پھر البتہ یہ ضرور کلّے کو اکھاڑے گا۔

میں نے کہا ابو اسے اب یہ خیال کیوں نہیں آتا تو انہوں نے کہا کہ جب یہ چھوٹا تھا تو اسے اس ''کلّے'' کے ساتھ باندھا گیا۔ اس نے اپنا پورا زور لگایا پوری طاقت آزمائی تھی لیکن یہ اسے اکھاڑ نہیں سکا تھا۔ اس جدوجہد میں اس کے تقریباً پانچ چھ سات ماہ گزرے، پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ میری طاقت سے اکھڑ نہیں سکتا اور اب وہ اسی خیال اور اندازے پر قائم ہے۔ تاہم وہ بات جب کی تھی اور اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کے بعد یہ تصور میرے ذہن میں ابھرنے لگا ہے کہ ہم خیال سے کس قدر بندھے ہوئے ہیں اور مائنڈ میٹر یعنی جسم کے اوپر کتنی حکمرانی کر رہا ہے۔ اگر مائنڈ طاقتور ہو تو آپ کا جسم آپ کی مرضی کے مطابق عمل کرنے لگے گا۔ لیکن آپ کہتے ہیں میں سگریٹ چھوڑ نہیں سکتا۔ سگریٹ چھوڑنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ایک خیال نے آپ کو اس بات کے ساتھ باندھا ہوا ہے۔ میں اپنی نواسی سے کہہ رہا تھا کہ ''تو نہ لڑیا کر اپنی سس

ناں'' کہنے لگی: ''نہیں میں ساس کے ساتھ لڑنے سے رہ نہیں سکتی۔ نانا میرا خیال یہ ہے کہ بس یہ بڑی کمینی عورت ہے'' میں نے کہا: ''تو اپنے خیال کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ ساس کے ساتھ بندھ کے دیکھ بڑا مزہ آئے گا'' اس نے کہا: ''دفع دُور میں نہیں بندھتی! زندگی میں اور جتنے مسائل ہیں وہ ایسے ہی ہیں۔''

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ امریکہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام ہیلن کیلے تھا۔ وہ مادرِزاد اندھی تھی اور مادرِزاد بہری بھی تھی اور اس طرح پیدائشی گونگی بھی، لیکن وہ ایک صحت مند لڑکی کی طرح پرورش پا رہی تھی۔ وہ ایک عجیب وغریب کیس تھا۔ اس نے یہ تہیہ کیا کہ میں تعلیم حاصل کروں گی۔ اس نے اپنے آپ کو اپنی ذات کو اس ''کلے'' کے ساتھ نہیں باندھا۔ وہ اب نہ کچھ بیان کر سکتی تھی کہ میں پڑھنا چاہتی ہوں نہ دیکھ کے بتا سکتی ہے کہ وہ کیا کرنے کی آرزو رکھتی ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ طلب پیدا ہوئی اور یہ طلب اتنی شدید ہوئی کہ اس کی ایک سہیلی کی خالہ تھی۔ اس کا بازو اس نے پکڑ کر اس طرح سے دبایا کہ اس خالہ نے محسوس کیا کہ یہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پھر ان دونوں نے بڑی مدت کے بعد زور لگا کر ایک زبان ڈویلپ کی جو اس کے بدن کو دبا کر بیان کرتی تھی اور وہ اسے سمجھتی تھی۔ ایک بار شپ کا لفظ آیا۔ لیکن اس لڑکی کو شپ یا جہاز کے بارے میں کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کی استاد نے کہا کہ شپ سمندر میں چلتا ہے۔ اب اسے سمندر کا بھی کوئی پتا نہیں تھا۔ لیکن اس لڑکی نے کہا کہ وہ علم ضرور حاصل کرے گی اور اس کا خیال اس پر حاوی نہیں ہوگا اور میں خیال کو خود پر حاوی ہونے نہیں دوں گی۔ چنانچہ اس لڑکی نے

سارا وقت اور ساری توجہ اپنے ذہن کے ساتھ جدوجہد کرنے میں گزار دی اور اپنے مائنڈ کو حکم دیا کہ میرے بدن پر اپنے آپ کو اپلائی کر۔ مجھے وہ علم عطا کر جو دوسرے لوگ اپنی جسمانی ساخت پوری ہونے کے سبب حاصل کرتے ہیں۔ اور اس نے یہ کہا اور پانچ کتابیں اس نے لکھیں۔

وہ یہاں لاہور بھی آئی تھی پاکستان بننے کے بعد اور ہم بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے گئے تھے۔ وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اپنے استادوں کے مخصوص طریقے سے سوالات کے کھٹ کھٹ کر کے مخصوص انداز میں جواب دیتی تھی۔ وہ اپنی آٹو بائیو گرافی میں ایک کمال کی بات لکھتی ہے کہ دیکھو میں بہت خوش ہوں کہ میرے خدا نے میرے اوپر بڑا کرم کیا ہے۔ اگر یہ ساری چیزیں یہ ساری نعمتیں اندھے ہونا، بہرے ہونا، گونگے ہونا مجھے نہ ملی ہوتیں تو میں دنیا کی نامور عورت نہ ہوتی بلکہ ایک معمولی گھریلو عورت ہوتی۔

اللہ کی نعمت کے کیا کیا رُوپ ہیں اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور شاباش ہے اس بی بی پر جس نے اسے نعمت کہہ کر پکارا۔ جب آپ کو کوئی خیال پکڑ لیتا ہے اور آپ اس کے تابع ہو جاتے ہیں تو معاملہ گڑ بڑ ہوتا ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ کبھی کبھی بیٹھ کر جب وقت ملے تو ضرور غور کیا کیجئے کہ آیا مجھ کو کسی ''کلے'' یا ''سنگل'' نے پکڑا ہوا ہے یا کسی خیال نے پکڑا ہوا ہے۔ جب یہ بات آپ کے ذہن میں آ جائے گی، آپ بڑی آسانی سے اپنا مسئلہ خود حل کر لیں گے۔ خیال کی طاقت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد میں کالج میں ایم اے کے چوتھے سال میں پڑھتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس سال آدمی بڑا لائق فائق



اور ذہین ہوتا ہے۔ اس جیسا دنیا میں اور کوئی ہوتا ہی نہیں اور ہم یہی سمجھتے تھے۔ میرے والد اور میرے ماموں کو خاص طور پر میرے ماموں کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ میں نماز پڑھا کروں۔ چنانچہ وہ دونوں بیچارے اپنے اپنے طریقے سے کوشش کرتے تھے۔ لیکن میں اپنے خیال میں اتنا پڑھا لکھا تھا کہ میں باقاعدہ دلائل دیتا تھا کہ نماز میں کیا رکھا ہے۔ اللہ کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جیسے پڑھے لکھے لوگ کہا کرتے ہیں۔

وہ کچھ کہتے نہیں تھے۔ وہ مجھے پکڑ کر ایک مولوی صاحب کے پاس لے گئے جو ہمارے شہر لاہور میں نیلا گنبد کی مسجد کے علاقے میں تھے۔ وہ مولوی صاحب وہاں بیٹھے لیکچر دے رہے تھے اور ان کے پاس تین پہیوں کی چیئر تھی۔ وہ چل نہیں سکتے تھے۔ ان کی ایک ٹانگ پر بڑی خوفناک بیماری کا حملہ تھا جسے ''گھمبیر'' وغیرہ کہتے ہیں۔ میرے والد نے کہا کہ جی! یہ میرا بیٹا ہے۔ وہ کہنے لگے ماشاءاللہ بڑا اچھا ہے۔ لائق، ذہین، خوبصورت اور فطین لڑکا ہے۔ میرے والد صاحب نے ان سے مجھے کچھ سمجھانے کا کہا تو وہ کہنے لگے نہیں پھر کسی دن آپ لوگ آئیں گے تو تلقین کریں گے۔ آج موقع نہیں ہے اور تلقین زیادہ کرنی بھی نہیں چاہیے۔ یہ آتا رہے ملتا ملاتا رہے۔ مجھے ان کی شخصیت نے بڑا متاثر کیا لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی نوجوانوں کے پاس کہاں وقت ہوتا ہے ایسے کام کرنے کا شرافت کا یا عبادت کا۔

میں نے کالج میں اپنے دوستوں کو بتایا تو انہوں نے کہا: ''ناں ناں خبردار! اس چکر میں نہ پھنس جانا۔ ہمیں دنیا بنانی ہے ترقی کرنی ہے'' ایک ہمارا ساتھی مولوی سے پڑھتا

تھا۔اس نے فوراً ایک آیت قرآنی کا ترجمہ پڑھا: ''کوشش کرو دنیا کی طرف۔'' خیر وقت گزرتا رہا اور میں کبھی کبھی مولوی صاحب کے پاس جا کر ملتا رہا۔ان مولوی صاحب کا نام تھا مفتی محمد حسن۔ وہ بڑے جید عالم تھے۔انہوں نے بڑی اونچے اونچے کام کیے تھے۔ آپ نے فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ دیکھا ہوگا۔اس کی بنیاد مفتی محمد حسن نے ہی رکھی تھی اور ان کی ہی نگرانی میں اتنی بڑی یونیورسٹی بنی۔ان کے جو مریدین تھے اور ان کے جو چاہنے والے تھے جن میں میرے ماموں بھی شامل تھے۔مولوی صاحب بار بار ان سے کہتے تھے کہ یہ ٹانگ اب ٹھیک نہیں ہوگی۔کاٹنی پڑے گی۔اس سے ان کے چاہنے والوں کو بڑی تکلیف تھی۔انہوں نے مولوی صاحب سے ٹانگ کاٹنے پر بہت زور دیا اور کہا کہ اگر ڈاکٹر ٹانگ کاٹنے کا کہتے ہیں تو پھر اس میں کیا مضائقہ ہے۔میں آپ کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا واقعہ بتا رہا ہوں۔اس زمانے کے بہت اعلیٰ درجے کے سرجن کرنل امیر الدین ہوا کرتے تھے۔وہ بڑے نامی گرامی سرجن تھے۔انہوں نے بھی ٹانگ کے کاٹنے کی ہی رائے دی۔

آخر کار ٹانگ کاٹنے کا وقت مقرر ہوگیا۔جیسا کہ ڈاکٹر لوگ کرتے ہیں۔صبح کے وقت ان کی ٹانگ کاٹی جانی تھی اور اس سرجری میں ڈاکٹر کرنل عطاء اللہ، ڈاکٹر ریاض قدیر اور کرنل امیر الدین نے حصہ لینا تھا۔سب بڑی محبت اور پیار اور عقیدت اور تپاک کے ساتھ مفتی صاحب کو لے کر آئے ۔ اب ایک لائق بے ہوش کرنے والا Anaesthesist چاہیے تھا جو بالکل ہمہ وقت مستعد رہے تا کہ اس عمر کے شخص کی زندگی کو کوئی خدشہ یا خطرہ نہ ہو۔اب Anaesthesist کو بلایا گیا انہوں نے کہا مفتی



صاحب آپ کوتھوڑی سی تکلیف ہوگی کیونکہ ایک انجکشن دینا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ یہ کیوں دیتے ہوتو انہوں نے کہا کہ جی اتنا بڑا کام کرنا ہے تو اس وجہ سے بے ہوشی مقصود تھی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ آپ مجھے بے ہوش کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جی! آخر ٹانگ کاٹنی ہے۔ اس میں چاقو، چھری اور آری کی بھی ضرورت پڑے گی۔ مفتی صاجب کہنے لگے ، ڈاکٹر صاحب ! آپ ایسا کریں کہ آپ مجھ کو ایسے ہی چھوڑ دیں اور Anaesthesia وغیرہ نہ دیں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ یہ دخل انداز ہوگا میرے ذہن پر اور میں اپنا ذہن سوائے اللہ کے اور کسی کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ تو آپ اپنا کام کریں، میں اپنا کام کرتا ہوں۔

انہوں نے کہا، سر! آپ اپنا کام کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا، جو بھی میرا کام ہوا کروں گا اور منہ پر کپڑا لے کر لیٹ گئے۔ اب ٹانگ کٹ رہی تھی اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر جلدی جلدی ٹانکے لگا رہے تھے اور کرنل عطاء اللہ وہ نبض پکڑے بیٹھے ہوئے تھے تاکہ پتا چلتا رہے کہ ان کا بلڈ پریشر کہاں چلا گیا ہے۔ کام ختم ہوا، اور جب پٹی باندھ دی گئی اور تینوں ڈاکٹر حیران پریشان کھڑے ہوگئے تو پھر مفتی صاحب نے اُن سے پوچھا ''میاں ہوگیا کام؟'' انہوں نے کہا جی ہوگیا۔ تب مفتی صاحب نے کہا ''بہت بہت شکریہ! میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔'' جو شخص اپنے خیال پر حاوی ہو جائے اور خیال اس کے تصور میں گرفت میں آجائے اور انسان یہ جان لے کہ Mind over matter کیسے ورک کرتا ہے تو یہ ساری مشکلات جو روز ہمیں پیش آتی رہتی ہیں

اور ہم ہاتھی جتنا ڈیل ڈول لے کر اپنے ''کلّے'' سے ڈرتے رہتے ہیں جو ایک فٹ کا بھی نہیں ہوتا اور ساری مشکلات لپیٹ کے ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے ہمارے لیے علم کا اور غصہ کرنے کا، تفکر کا، فکر کرنے کا بڑا حکم آیا ہے کہ غور کریں اب تفکر کرنے کے طریقے ہیں: نماز، روزہ، زکوٰۃ تو عبادات میں آ جاتی ہیں۔ تفکر کرنے کے لیے آپ کو الگ سے جیسا کہ اللہ چاہتا ہے کہ جب نمازیں ادا کر چکو تو تب میرا ذکر کرو۔ دیکھئے نا کہ ذکر سے مفتی محمد حسن کہاں پہنچ گئے اور کیسے انہوں نے تقویت حاصل کر لی کہ میڈیکل ہسٹری میں یہ بات درج ہو کر رہ گئی۔

اگر آپ اور میں اور ہم سب اس باریکی کو سمجھنے لگیں کہ مائنڈ کے اوپر جسم کا اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا مائنڈ کا اپنا ہوتا ہے تو پھر آپ ان مشکلات سے خود بخود نکل آئیں گے۔ آپ کو کسی بابے کی، کسی پیر کی، کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!



موضوع

معمۂ زندگی

منظر: اشفاق صاحب کریم کلر کشمیری شال، کالا کڑھائی والا کرتا اور شلوار پہنے صوفے سے ٹیک لگائے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ پس منظر میں جالی والی کھڑکی نمایاں ہے۔

مہمان: محمود اختر (ڈراما آرٹسٹ)

معمۂ زندگی

(یہ پروگرام اشفاق احمد کی زندگی میں ٹیلی کاسٹ ہونے والا آخری پروگرام تھا)

اِن دنوں میرا پوتا، جو اَب بڑا ہو گیا ہے عجیب عجیب طرح کے سوال کرنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کو بڑا حق پہنچتا ہے سوال کرنے کا۔ اُس کی ماں نے کہا کہ تمہاری اُردو بہت کمزور ہے تم اپنے دادا سے اُردو پڑھا کرو۔ وہ انگریزی سکول کے بچے ہیں، اس لیے وہ زیادہ اُردو نہیں جانتے۔ خیر! وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ اُردو سیکھنے کے دوران میں وہ کچھ اور طرح کے سوالات بھی کرتا ہے۔ پرسوں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ دادا! یہ آمد و رفت جو ہے اس میں عام طور پر کتنا فاصلہ ہوتا ہے؟ اُس نے یہ لفظ نیا



نیا پڑھا تھا۔ اب اس نے ایسی کمال کی بات کی تھی کہ میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ دادا! کیا نفسیات کی ایسی کوئی کتاب ہے جس میں آدمی کو پرکھنے کے اچھے سے اور آسان سے طریقے ہوں ؟ تو میں نے کہا کہ بھئی! تمہیں آدمی کو پرکھنے کی کیا ضرورت پیش آ رہی ہے؟ اس نے کہا کہ پتہ تو چلے کہ آخر مد مقابل کیسا ہے؟ کس طرز کا ہے؟ جس سے میں دوستی کرنے جا رہا ہوں یا جس سے میری ملاقات ہو رہی ہے۔ میں اُس کو کس کسوٹی پر لٹمس پیپر کے ساتھ چیک کروں۔ میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر تم ایسا چاہتے ہی ہو تو ظاہر ہے علم نفسیات میں بہت ساری ایسی کتابیں ہیں کہ

HOW TO UNDERSTAND PEOPLE? HOW TO CHECK HUMAN BEINGS?

ایسی بیشمار کتابیں ہیں لیکن وہ ساری اتنی ٹھیک نہیں جتنی ہمارے ہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ ہماری استاد تو ہماری تائی تھی۔ میں نے پہلے بھی اس کے بارے میں آپ لوگوں کو بتایا ہے لیکن آپ میں سے شاید بہت سے لوگ نئے ہیں اور اُن کو تائی کے بارے میں پتہ نہ ہو جسے سارا گاؤں ہی "تائی" کہتا تھا۔ بڑے کیا چھوٹے کیا، سبھی۔ وہ ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ تیلی جو میری پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے اُن کی بیوہ تھیں۔ ہماری تائی تیلن تھی، تیل نکالتی تھی اور کچی گھانی کا خالص سرسوں کا تیل بیچتی تھی۔ سارے گاؤں والے اس سے تیل لیتے تھے۔ خود ہی بیل

چلاتی تھی بڑی لٹھ جو بہت مشکل ہوتی ہے بیلوں سے وہ اکیلی نکال لیتی تھی۔ میں جب اس سے ملا تو اس کی عمر 80 برس کی تھی۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا لیکن مجھے اس تائی کی شخصیت نے متاثر بہت کیا۔ وہ اتنی خوش مزاج اتنی عطا کرنے والی اور خوش بختی کا سامان مہیا کرنے والی تھی کہ جس کا حساب نہیں۔ شام کے وقت گاؤں کے لوگ بزرگ، ہندو، سکھ سب اس کے پاس جمع ہو جاتے تھے کہ ہمیں کوئی دانش کی بات اس کے ہاں سے ملے گی۔ ایک طرح سے یوں سمجھئے کہ اس کا گھر کافی ہاؤس تھا جس میں زمیندار لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ایک بار میں نے تائی سے پوچھا کہ یہ تیری زندگی جو گزری ہے اس کا میں تو شاہد نہیں ہوں وہ کس قسم کی تھی؟ اس نے بتایا کہ میں 26 برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور پھر اس کے بعد اب میری عمر دیکھ لو تمہارے سامنے ہے۔ 80 برس ہے۔ میں ایسے ہی رہی لیکن میں کڑوی بہت تھی اور تلخ طبیعت کی ہو گئی۔ جب میں بیوہ ہو گئی میں خدا پر بھی تنقید کرتی تھی، حالات پر بھی، وقت پر بھی، لوگوں پر بھی، اور میری کڑواہٹ میں مزید اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ میری شخصیت کو وہ سکون نہیں ملتا تھا جس کی میں آرزو مند تھی لیکن میں ہر بندے کو اچھی طرح سے کھڑکا دیتی تھی اور وہ شرمندہ ہو کر اور گھبرا کر میرے ہاں سے رخصت ہوتا تھا۔ تو میں نے ایک اور یہ فیصلہ کیا کہ اس عورت میں اللہ نے فیصلے کی بڑی صلاحیت رکھی ہوئی ہے اگر مجھے آدمیوں کو لوگوں کو سمجھنا ہی ہے اگر مجھے ان کی روحوں کے اندر



گہرا اترنا ہے تو میرا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ مجھے ان پر **Criticism** کرنا تنقید کرنا نکتہ چینی کرنا چھوڑنا ہوگا۔ جب آپ کسی شخص پر نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیتے ہیں اس پر تنقید کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس میں نقص نکالنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آدمی سارے کا سارا آپ کی سمجھ میں آنے لگتا ہے اور ایکسرے کی طرح اس کا اندر اور باہر کا وجود آپ کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔

اب یہ اس کا بھی فلسفہ تھا اور کچھ بڑوں سے بھی اس نے حاصل کیا تھا، وہ بھی تھا۔ جب بھی مجھے کوئی ایسا مشکل مسئلہ ہوتا تو میں ضرور اس سے ڈسکس کرتا کہ اس کو کیسے کرنا ہے۔ اکیلا میں ہی نہیں سارے ہی اس سے ڈسکس کرتے تھے کیونکہ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ کسی کی خرابیاں تلاش کرنے کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے اور ظاہر ہے کہ آدمی کسی کی خوبیوں پر نظر نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ڈھونڈنی چاہئیں ۔ وہ تائی واحد ایسی فرد تھی جو کہ بُرے سے بُرے آدمی میں بُرے سے بُرے وجود میں سے بھی خوبی تلاش کر لیتی تھی۔ میرا بھائی جو مجھ سے دو جماعتیں آگے تھا وہ بھی تائی کے اس روّیے سے بڑا تنگ تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ایک دن اس نے ایک ترکیب سوچی ۔ اس نے کہا کہ یار! میں ابھی تائی کو پھانستا ہوں، کیونکہ وہ بالکل اَن پڑھ ہونے کے باوصف ہم سے بہت آگے چلی جا رہی ہے۔ میں نے آج ایک معمہ بنایا ہے اسے لے کر تائی کے پاس چلتے ہیں۔ لیکن

تم بہت سنجیدہ رہنا اور معصوم سے میسنے سے بن کر کھڑے ہو جانا۔ یہ تائی ہر چیز کی تعریف کرتی ہے کبھی آج تک اس کو کسی میں نقص نظر نہیں آیا پھر زندگی کا مزہ کیا ہے کہ آدمی کسی نقص کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا چلا جائے اور اردگرد پڑوس میں عورتیں آباد ہوں اور آدمی ان میں نقص ہی نہ نکالے۔ بیبیاں تو فوراً کھڑکی کھول کر دیکھتی ہیں کہ اس کے گھر میں کون آیا ہے؟ کون گیا؟ فٹافٹ نقص نکالنے اور خرابی کی وضاحت پیش کرنے کے لیے ان کو موقع چاہیے ہوتا ہے۔

خیر! ہم گئے۔ میرے بھائی نے بہت اَدب کے ساتھ اس سے کہا اور وہ خوش تھا کہ اب تائی پھنس جائے گی ''تائی! یہ شیطان کیسا ہے؟'' تائی کہنے لگی: ''پُت! ابلیس؟'' وہ کہنے لگا: ''ہاں'' تائی کہنے لگی: ''ہائے ہائے صدقے جاواں۔ وہ بڑا ہی محنتی ہے۔ جس کم دا تہیہ کر لے اس کو چھوڑتا ہی نہیں پورا کر کے دم لیتا ہے۔ کیا کہنے اس کے وہ ہماری طرح سے نہیں ہے کہ کسی کام میں آدھا دل اِدھر اور آدھا دل اُدھر اس نے جس کام کی ٹھان لی پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے'' میں نے بھائی سے کہا کہ آ جاؤ یہاں ہماری دال نہیں گلے گی یہ اور طرح کی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے جو لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ نہیں کھڑے ہو سکتے۔

میں اپنے پوتے سے یہ کہہ رہا تھا ظاہر ہے کہ بہت عرصہ بیت گیا، اَب تائی اس جہاں میں موجود نہیں ہے لیکن میں اس سے اپنے حوالے سے اور حیثیت سے بات



کررہا تھا کہ آدمی کو اپنے آپ کو جاننے کے لیے دوسرے آدمی کے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک آپ دوسرے آئینے کو نہیں بنائیں گے آپ کو اپنی ذات کی شکل نظر نہیں آئے گی۔ اگر آپ اس کے اوپر کالک ملتے رہیں گے تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اتفاق سے اب ہمارے ہاں **Criticism** کچھ زیادہ ہی ہونے لگا ہے اور کچھ ہمیں پڑھایا بھی جاتا ہے۔ کچھ ہماری تعلیم بھی ایسی ہے۔ کچھ ہم ایسے **West Oriented Educated** لوگ ہو گئے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ ہر بات کا احتساب کرو اس پر تنقید کرو اور ہر چیز کو تسلیم کرتے ہوئے اور ایسے ہی آگے چلتے ہوئے زندگی بسر نہ کرو۔

جب میں لکھنے لکھانے لگا اور میں چھوٹا سا ادیب بن رہا تھا یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے اس وقت ہمارے لاہور میں ایک کافی ہاؤس ہوتا تھا وہاں بڑے سینئر ادیب رات گئے تک نشست کرتے تھے۔ تو ہم بھی اُن کے پاس بیٹھ کر اُن سے باتیں سیکھتے تھے۔ اُن سے بات کرنے کا شعور حاصل کرتے تھے اور اپنے مسائل بھی اُن سے بیان کرتے تھے۔ اس زمانے میں راجندر سنگھ بیدی یہاں ڈاکخانے میں کام کرتے تھے۔ پریم چند بھی ''کافی ہاؤس'' میں آجاتے تھے اور اس طرح بہت بڑے لوگ وہاں آجاتے تھے۔ میں رات دیر سے گھر آتا تھا میری ماں ہمیشہ میرے آنے پر ہی اُٹھ کر چولہا جلا کر روٹی پکاتی تھی۔ اس زمانے میں گیس ویس تو ہوتی نہیں تھی اور

میں ماں سے ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ روٹی رکھ کر سو جایا کریں تو وہ کہتیں تُو رات کو دیر سے آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجھے تازہ پکا کر روٹی دوں۔ جیسا کہ ماؤں کی عادت ہوتی ہے۔ میں ان سے اس بات پر بہت تنگ تھا اور میں نے ان سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر آپ اسی طرح رات دیر سے اُٹھ کر روٹی پکاتی رہیں تو میں پھر کھانا ہی نہیں کھاؤں گا۔ ایک دن یونہی رات دیر سے میرے آنے کے بعد پھلکا پکاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا: ''کہاں جاتا ہے؟'' میں نے کہا: ''اماں! میں ادیب بن رہا ہوں۔'' کہنے لگیں: ''وہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے کہا: ''اماں! لکھنے والا لکھاری'' وہ پھر گویا ہوئیں: ''تو پھر کیا کرے گا؟'' میں نے کہا: ''میں کتابیں لکھا کروں گا۔'' وہ کہنے لگیں: ''اینیاں اُگے پیاں جیہڑیاں کتاباں نیں اونہاں دا کی بنے گا؟'' میں نے کہا: ''نہیں! نہیں وہ تو جھوٹ ہیں کچھ نہیں۔ میں اور طرح کا رائٹر بنوں گا اور میں سچ اور حق کے لیے لڑوں گا اور میں ایک سچی بات کرنے والا بنوں گا۔''

میری ماں کچھ ڈر گئی۔ بیچاری اَن پڑھ عورت تھی گاؤں کی۔ میں نے کہا: ''میں سچ بولا کروں گا اور جس سے ملوں گا سچ کا پرچار کروں گا اور پہلے والے لکھاری بڑے جھوٹے رائٹر ہیں'' مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت ماں کے ہاتھ میں پکڑے چمٹے میں روٹی اور پتیلی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی: ''اگر تو نے یہی بننا ہے جو تو کہتا ہے اور تو نے سچ ہی بولنا ہے تو اپنے بارے میں سچ بولنا۔ لوگوں



کے بارے میں سچ بولنا نہ شروع کر دینا۔" یہ میں آپ کو بالکل اَن پڑھ عورت کی بات بتا رہا ہوں۔ سچ وہ ہوتا ہے جو اپنے بارے میں بولا جائے جو دوسروں کے بارے میں بولتے ہیں وہ سچ نہیں ہوتا۔ ہماری یہ عادت بن چکی ہے اور ہمیں ایسے ہی بتایا، سکھایا گیا ہے کہ ہم سچ کا پرچار کریں۔

جب ہم بابا جی کے پاس گئے اور کبھی کبھی ان کے سامنے میرے منہ سے یہ بات نکل جاتی تھی کہ میں سچی اور حق کی بات کروں گا تو وہ کہا کرتے تھے سچ بولا نہیں جاتا، سچ پہنا جاتا ہے، سچ اُوڑھا جاتا ہے، سچ اُوڑھنے کی چیز ہے، بولنے کی چیز نہیں ہے۔ اگر اسی طرح اور یوں ہی سچ بولو گے تو جھوٹ ہو جائے گا۔ جب تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا ہے اور یہ حسرت اور آرزو ہی رہی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے میں کم اَزکم ایک دن سچ اُوڑھ کر باہر نکلوں اور ساری دنیا کا درشن کر کے پھر واپس لوٹوں اُوڑھا ہوا سچ معلوم نہیں کتنا خوبصورت ہوتا ہوگا، بولا ہوا تو آپ کے سامنے ہی ہے وہ اچھا نہیں ہوتا۔ جب آدمی کسی کو Criticise کرتا ہے اور کسی کے اوپر تنقید کرتا ہے تو حکم تو یہ ہے کہ آپ دیکھ لیں اور اس کی عینی شہادت لیں کہ آیا اس میں ایسی کوئی خرابی ہے بھی کہ نہیں۔ اگر وہ نظر بھی آ جائے اور خرابی ہو بھی تو پھر بھی اس کا اعلان نہ کریں۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کسی کی خرابی کا اعلان کرنے کی اللہ ستار العیوب ہے۔ اگر اللہ خداوند تعالیٰ ہماری چیزوں کو

اُجاگر کرنے لگے تو توبہ توبہ ہم تو ایک سیکنڈ بھی زندہ نہ رہیں لیکن وہ ہمارے بھید للکو کر چھپا کر رکھتا ہے۔ تو ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگوں کی خرابیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں۔ اگر آپ کو کسی میں خرابی نظر آئے تو یہ دیکھیں کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا میں انہی Cricumstances میں ہوتا اور میں ایسے حالات میں سے گزرا ہوا ہوتا بچپن میں یتیم ہو گیا ہوتا یا کسی کے گھر پلا ہوتا تو میری شخصیت کیسی ہوتی؟ یہ ایک بات بھی غور طلب ہے۔

ممکن ہے آپ کی آنکھ میں ٹیڑھ ہو اور اس بندے میں ٹیڑھ نہ ہو۔ ایک واقعہ اس حوالے سے مجھے نہیں بھولتا جب ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ یہ لاہور میں ایک جگہ ہے۔ وہ ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ اچھا پوش علاقہ تھا۔ وہاں ایک بی بی بہت خوبصورت ماڈرن قسم کی بیوہ عورت نوعمر وہاں آ کر رہنے لگی۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم جو سمن آباد کے ''نیک'' آدمی تھے ہم نے دیکھا کہ ایک عجیب وغریب کردار آ کر ہمارے درمیان آباد ہو گیا ہے اور اس کا اندازِ زیست ہم سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ ایک تو وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے خوبصورت کپڑے پہنتی تھی پھر اس کی یہ خرابی تھی کہ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ تیسری اس میں خرابی یہ تھی کہ اس کے گھر کے آگے سے گزرو تو خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ اس کے جو دو بچے تھے وہ گھر سے باہر بھاگے پھرتے تھے اور کھانا گھر پر نہیں کھاتے تھے۔ لوگوں کے گھروں میں چلے جاتے تھے اور جن گھروں

میں جاتے وہیں سے کھا پی لیتے تھے یعنی گھر کی زندگی سے ان بچوں کی زندگی کچھ کٹ آف تھی۔ اس خاتون کو کچھ عجیب وغریب قسم کے مرد بھی ملنے آتے تھے۔ گھر کی گاڑی کا نمبر تو روز دیکھ دیکھ کر آپ جان جاتے ہیں لیکن اس کے گھر آئے روز مختلف نمبروں والی گاڑیاں آتی تھیں۔ ظاہر ہے اس صورتحال میں ہم جیسے بھلے آدمی اس سے کوئی اچھا نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے۔ اس کے بارے میں ہمارا ایسا ہی روّیہ تھا جیسا آپ کو جب میں یہ کہانی سنا رہا ہوں تو آپ کے دل میں لامحالہ اس جیسے ہی خیالات آتے ہوں گے۔ ہمارے گھروں میں آپس میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں کہ یہ کون آ کر ہمارے علاقے میں آباد ہوگئی ہے۔ میں کھڑکی سے اسے جب بھی دیکھتا وہ جاسوسی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اسے کسی چولہے چوکے کا کوئی خیال نہ تھا۔ بچوں کو بھی کئی بار باہر نکل جانے کو کہتی تھی۔

ایک روز وہ سبزی کی دکان پر گر گئی۔ لوگوں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے وینٹے مارے تو اسے ہوش آیا اور وہ گھر گئی۔ تین دن کے بعد وہ فوت ہوگئی حالانکہ اچھی صحت مند دکھائی پڑتی تھی۔ جو بندے اس کے ہاں آتے تھے انہوں نے ہی اس کا کفن دفن کا سامان کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کے ہاں آنے والا ایک بندہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ اس عورت کو ایک ایسی بیماری تھی جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس کو کینسر کی ایسی خوفناک صورت لاحق تھی Skin وغیرہ کی کہ اس کے بدن سے بدبو بھی

آتی رہتی تھی۔ جس پر زخم ایسے تھے اور اسے خوشبو کے لیے سپرے کرنا پڑتا تھا تاکہ کسی قریب کھڑے کو تکلیف نہ ہو۔ اس کا لباس اس لیے ہلکا ہوتا تھا اور غالباً ایسا تھا جو بدن کو نہ چھبے۔ دوسرا اس کے گھر آنے والا اس کا وکیل تھا جو اس کے حقوق کی نگہبانی کرتا تھا۔ تیسرا اس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا جو اپنی بھابی کو ملنے آتا تھا۔ ہم نے ایسے ہی اس کے بارے میں طرح طرح کے اندازے لگا لیے اور نتائج اخذ کر لیے اور اس نیک پاکدامن عورت کو جب دورہ پڑتا تھا تو وہ بچوں کو دھکے مار کر باہر نکال دیتی تھی اور تڑپنے کے لیے وہ اپنے دروازے بند کر لیتی تھی۔

میرا یہ سب کچھ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تنقید اور نقص نکالنے کا کام اللہ پر چھوڑیں وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ ہم اللہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہ اُٹھائیں، کیونکہ اس کا بوجھ اُٹھانے سے آدمی سارے کا سارا چبہ ہو جاتا ہے، کمزور ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

اوراد و وظائف

جو زندگی کے آخری ایام میں
بابا جی (اشفاق احمد)
کا معمول رہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ص وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ
اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ
اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ
اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ○ (ال عمران. ۱۰۳)

ترجمہ: اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر اُلفت دی تمہارے دلوں میں اَب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے پھر تم کو اس سے نجات دی اسی طرح کھولتا ہے اللہ تم پر آیتیں تا کہ تم راہ پاؤ۔



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ
ذُنُوْبَکُمْ ط وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (ال عمران. ۱۰۳)

ترجمہ: تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔





بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

مَا اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَمَنۡ یُّؤۡمِنۡ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ○ (التغابن۔ ۱۱)

ترجمہ: نہیں پہنچتی کوئی تکلیف بدون حکم اللہ کے اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر وہ راہ بتلائے اس کے دل کو اور اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔



حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡنَا ○ (ال عمران۔ ۱۷۳)

ترجمہ: کافی ہے ہمارے لیے اللہ اور وہ بہت ہی اچھا کارساز ہے اللہ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا ہے۔



اَللّٰھُمَّ لا سَھۡلَ اِلَّا مَا جَعَلۡتَہٗ سَھۡلًا، وَ اَنۡتَ تَجۡعَلُ الۡحَزۡنَ سَھۡلًا اِذَا شِئۡتَ ○

ترجمہ: اے اللہ! کوئی کام بھی آسان نہیں بجز اس کے جس کو تو آسان کردے اور تو جب چاہے سنگلاخ (زمینوں) کو بھی نرم و ہموار کردے۔



بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۝ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ۝ وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۝ وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا وَتَخَلَّتۡ ۝ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ۝

(الانشقاق. ۱ تا ۵)



لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝

(الانبیاء.۸۷)



اَمَّنۡ يُّجِيۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ

(سورہ النمل. ۶۲)

ترجمہ: بھلا کون پہنچتا ہے بیکس کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے اور دور کر دیتا ہے سختی۔

بابا جی کے مطابق روزانہ بعد نماز عشا پانچ سو مرتبہ پڑھیں چالیس دن تک یہی عمل کریں۔ ان شاء اللہ ہر جائز مراد بر آئے گی۔

وظیفہ کے شروع و آخر میں گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں۔



يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ ○ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ط



فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قف اَنْتَ وَلِيّٖ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ ○ (یوسف۔ ۱۰۱)

ترجمہ: اے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا رفیق ہے۔ تو مجھ کو اپنی فرماں برداری کی حالت میں (دنیا سے) اٹھا لے اور مجھ کو (اپنے) نیک بندوں میں داخل کر۔



رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ط وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا صلے ق رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْعَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ○ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّكَ لَا

تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○ (آل عمران (۱۹۱ تا ۱۹۴)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! تو نے اس (دنیا) کو بے فائدہ نہیں بنایا تیری ذات پاک ہے۔تو اے ہمارے رب ہم کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔اے ہمارے پروردگار! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اُس کو (بہت ہی) ذلیل کیا۔اور (وہاں) گنہگاروں کا کوئی بھی مددگار نہیں۔اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے (یعنی نبی) کو سنا کہ ایمان کی منادی کر رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔تو ہم ایمان لے آئے۔پس اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف فرما اور ہماری برائیوں کو دور کر اور ہمارا نیک بندوں کے ساتھ خاتمہ کر اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے جیسے جیسے وعدے اپنے رسولوں کی معرفت تو نے ہم سے فرمائے ہیں، ہم کو نصیب کر اور قیامت کے دن ہم کو ذلیل نہ کر کہ تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔



اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَالْحَیُّ الْقَيُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ

ترجمہ: میں بخشش چاہتا ہوں اللہ سے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ رہنے والا اور زندہ ہے اور میں اس کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔





بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ مَّا اخْتَلَفَ الْمَلَوَانِ وَتَعَاقَبَ الْعَصَرَانِ وَ کَرَّالْحَدِیْدَانِ وَاسْتَقْبَلَ الْفَرْقَدَانِ وَ بَلِّغْ رُوْحَہٗ وَاَرْوَاحَ اَھْلِ بَیْتِہٖ مِنَّا التَّحِیَّۃَ وَالسَّلَامَ وَ بَارِکْ وَ سَلِّمْ عَلَیْہِ کَثِیْرًا ط

ترجمہ: الٰہی رحمتیں نازل فرما ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں تک رات دن آتے جاتے رہے اور ایک کے بعد دن اور رات آئے اور پھیرا کر کے دن رات اور دو تارے پھیرا کر کے اور جو قطب شمالی کے آس پاس سے اور استقبال کرتے رہے اور ہماری طرف سے آپ کی روح کو اور آپ کے خاندان کی روحوں کو تحیت اور برکت اور بہت سلام نازل فرمائیں۔



بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَاَنْبِیَآئِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ جَمِیْعِ خَلْقِہٖ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلَیْہِ وَ عَلَیْھِمُ السَّلَامُ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ

ترجمہ: خدا اور فرشتے اور پیغمبروں نبیوں، رسولوں اور پوری مخلوق کی طرف سے درود اور رحمت اتارے ہمارے سردار پر جن کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہے اور آپؐ کی امت پر اور سب پر درود و سلام و رحمت و برکت نازل ہو۔
باباجی فرماتے تھے: جو شخص جمعہ کے دن ایک سو مرتبہ (۱۰۰) روزانہ تین مرتبہ یہ درود شریف پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ پوری مخلوق کی گنتی کے برابر ثواب عطا کرے گا اور قیامت کے دن آپ کی جماعت کے ساتھ رہے گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کریں گے۔



دُعائے قنوت

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَ نَسْتَغْفِرُکَ وَ نُؤْمِنُ بِکَ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَ نُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ ط وَ نَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ ط اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَ نَسْجُدُ وَ اِلَیْکَ نَسْعٰی وَ نَحْفِدُ وَ نَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَ نَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ ط

اے اللہ ہم تجھ سے مدد چاہتے ہیں اور تجھ سے معافی مانگتے ہیں اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں اور تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تیرا شکر کرتے ہیں اور تیری ناشکری نہیں کرتے اور الگ کرتے ہیں اور چھوڑتے ہیں اس شخص کو جو تیری نافرمانی کرتے الٰہی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے



ہی لیے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں اور تیری ہی طرف دوڑتے اور خدمت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شک تیرا عذاب کافروں کو ملنے والا ہے۔



باتیں بابا جی کی



- پاکستان کا نوجوان خاص طور پر ایک آدمی اس کندھے کی تلاش میں ہے جس پر وہ اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ بیان کر سکے۔ (اللہ والے لوگ)
- جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو وہ ماضی جھوٹا ہے۔ (بابوں کی نشانیاں)
- جیسے معلوم کی دنیا ہے ایسے ہی نامعلوم کی دنیا بھی ہے اور جو اس کو تسلیم نہیں کرتا، اس کی سوچ بڑی محدود ہو جاتی ہے، کیونکہ لامعلوم کی دنیا پھیل جاتی ہے۔ (اپنے اندر کا سفر)
- اپنی دلیل روک لو، بندہ بچالو۔ اسے ذبح نہ ہونے دو کیونکہ وہ زیادہ قیمتی ہے۔ (نیک خواہشات)
- آپ عبادت کرتے بھی ہیں تو پھر آپ اپنی عبادت کو CELEBRATE بھی کیا کریں، جشن منائیں، جیسے مہندی پر لڑکیاں تھال لے کر ناچتی ہیں ناموم بتیاں جلا کر اس طرح سے۔ ورنہ تو آپ کی عبادت کسی کام کی نہیں ہوگی۔ (وفا کے موتی)
- دیے بغیر کام آگے نہیں چل سکتا، اور جوں ہی دینے سے ہاتھ روکتے ہیں، تو کہیں نہ کہیں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور ویرانی اور بربادی کے سامان ضرور شروع ہو جاتے ہیں۔ (اے وطن! پیارے وطن)
- الفاظ گولیوں کے مانند ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنے سے پہلے چیمبر کو صاف کر کے استعمال کریں، جس طرح آپ پستول کو صاف کرتے ہیں۔ (احساس)
- مومن وہ ہے جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔ (مہذب زندگی)
- اونٹ اُٹھنے کے انداز، میں دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی پچھلی ٹانگیں کھڑی کرتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اوپر بیٹھنے والا سب سے پہلے سجدہ کرتا ہے۔ (بلوچوں کا ڈیرہ)

Design By: 0300-4529821
Muhammad Ahsun

RS: 400



T & T
PUBLISHERS
BANK COLONY, SAMANABAD, LAHORE-54500 (PAKISTAN)
TEL: (042) 35080720 MOB: 0332 - 4822090